حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

(Quranic Studies Publishers)

میرے والد
میرے شیخ

میرے والد میرے شیخ

اور اُن کا مزاج و مذاق

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

(Quranic Studies Publishers)

فقیہ و شارحِ قرآن و مُفتیِ اعظم

وہ جس کی ذات میں تھیں جلوہ گر تمام صفات

"البلاغ" کا داعی وہ دعوتِ تبلیغ

رئیسِ آئنۂ علم و فضل جس کی ذات

یہ ذکر تھا کہ کہوں کوئی مصرعِ تاریخ

یہ فکر تھی کہ لکھوں سالِ اختتامِ حیات

تو اک تجلّیِ غیبی نے دی صدا کہ لکھو

"تجلّیاتِ محمّد شفیع" سالِ وفات

۱۳۹۶ھ

(رئیس امروہوی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد اللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی

حرف آغاز

احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی وفات کے بعد احباب نے بارہا فرمائش کی کہ حضرتؒ کی سوانح مرتب کر کے شائع کی جائے۔ لیکن پہلے یہ مناسب سمجھا گیا کہ احقر کے زیر ادارت ماہنامے "البلاغ" کا خصوصی نمبر حضرت کے تذکرے کے لئے نکالا جائے تاکہ اس میں متعلقہ مواد یکجا ہو جائے۔ چنانچہ البلاغ کا مفتی اعظم نمبر ۱۳۹۹ھ میں شائع ہوا جو تقریباً چودہ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اور اس میں بہت سے اہل قلم نے حضرتؒ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مقالات اور مضامین لکھے۔ احقر نے اس خصوصی نمبر کے لئے دو مضامین لکھے تھے۔ ان میں سے ایک کا عنوان تھا "میرے والد ---- میرے شیخ" اور اس مضمون میں حضرتؒ کی سوانح تاریخی اعتبار سے مرتب کرنے کے بجائے حضرتؒ کے علمی اور عملی مزاج و مذاق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

الحمد للہ کہ قارئین نے اس کو نہ صرف پسند فرمایا بلکہ بہت مفید قرار دیا، چونکہ کسی بزرگ کی سوانح پڑھنے والے کے لئے اہم ترین حصہ وہی ہوتا ہے جس میں اس کے مزاج و مذاق اور کردار کی وضاحت کی گئی ہو کیونکہ وہی چیز دوسروں کے لئے سبق آموز اور مشعل راہ ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے خیال ہوا کہ یہ مقالہ الگ کتابی شکل میں بھی شائع ہو جائے تاکہ وہ حضرات بھی اس سے استفادہ کر سکیں جو وہ ضخیم نمبر حاصل نہیں کر سکے۔

اس کتاب کے مطالعے میں یہ بات مد نظر رہنی چاہیے کہ یہ البلاغ کے مفتی اعظم نمبر کا ایک حصہ تھا لہٰذا اس میں جا بجا مفتی اعظم نمبر کے حوالے موجود ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو احقر اور قارئین کے لئے دنیا و آخرت کے لئے فائدہ مند بنائے اور اس کا نفع عام و تام فرمائے۔ آمین۔

یکم محرم الحرام ۱۴۱۵ھ

۱۲ جون ۱۹۹۴ء

وما توفیقی الا باللہ

احقر محمد تقی عثمانی عفا اللہ عنہ

فہرست عنوانات

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر

میرے والد ــــــ میرے شیخ

اور ان کا مزاج و مذاق

ذرا چشمِ تصور سے کام لوں تو یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت والد ماجد حیات تھے۔ آپ کے جلوۂ جہاں آرا کی زیارت ہر وقت میسر تھی اور ان کی دلآویز شخصیت میں ہر مشکل کا حل، ہر پریشانی کا علاج اور ہر غم و فکر کا مداوا موجود تھا۔ ہزار ذہنی الجھنوں کے عین درمیان جب قدم ان کے سادہ مگر باوقار کمرے کی طرف بڑھتے تو ان کی شفقتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہر الجھن کافور ہو جاتی اور ایسا محسوس ہوتا، جیسے کائنات کا سارا روحانی سکون و اطمینان سمٹ کر اس کمرے میں جمع ہو گیا ہے۔

حادثۂ وفات کو دو سال گزر چکے، لیکن اب بھی یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہماری ہر ہر نقل و حرکت میں شریک اور ہر ہر قدم پر ساتھ ہیں، کوئی نیا واقعہ پیش آتا ہے تو اچانک تصوّر کو ان کی آواز سنائی دیتی ہے اور کبھی کبھی تو اس آواز کا لہجہ ہی نہیں، انداز تخاطب بھی ایک پیکر محسوس میں تبدیل ہو کر دل کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔

تصوّر کی دنیا میں حضرت والد صاحبؒ سے ہر وقت اس قدر قریب ہونے کے باوجود جب کبھی عالم واقعات میں اپنے گرد و پیش کو دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اباّجی کی زندگی کے زمانے کو صرف دو سال نہیں گزرے بلکہ صدیاں بیت گئی ہیں، وہ کائنات کچھ اور تھی، یہ کچھ اور ہے اور دونوں کے درمیان وہی نسبت ہے جو بہار اور خزاں اور آبادی اور ویرانے کے درمیان ہو سکتی ہے۔

اس دوران بارہا ارادہ کیا کہ اپنی اس محبوب ترین ہستی کے بارے میں کچھ لکھوں جس میں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے ایک شفیق ترین باپ کی مٹھاس، ایک بالغ نظر استاد کی

توجہ، ایک باریک بین شیخ و مربّی کی عنایتیں اور ایک مونس و غمگسار کی ہمدردیاں بیک وقت جمع فرمادی تھیں لیکن ہزار کوشش کے باوجود میں حضرت والد صاحبؒ کی وفات پر اتنا بھی نہ لکھ سکا جتنا میں نے اپنے بعض دوسرے بزرگوں کے بارے میں لکھ دیا تھا۔ اس موضوع پر میں نے ہمیشہ اپنی زبان کو گنگ اور قلم کو ناکارہ پایا ہے اور آج بھی جب میں یہ صبر آزما فریضہ انجام دینے بیٹھا ہوں تو ذہن کی مثال اس چھوٹے سے سوراخ کی ہے جو مشکوں پانی کے دباؤ سے بند ہوگیا ہو تیس سال کی لذیذ و خوشگوار یادیں بیک وقت اس طرح قلب و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں کہ ان کا سرا تلاش کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ان یادوں کو بے کم و کاست کاغذ پر منتقل کرنا تو اب بھی میرے بس کی بات نہیں، لیکن ایک چیز ہے جسے میں اپنے پاس پوری امت کی امانت سمجھتا ہوں اور جسے دوسروں تک پہنچانا میرا فرض ہے اور وہ ہے حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا وہ مذاقِ زندگی جو انہوں نے اپنے قابلِ رشک اکابر سے ورثے میں پایا تھا اور جس میں ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ پوری طرح ڈھلا ہوا تھا۔ میرے لئے یہ دعویٰ بھی چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی کہ میں اس مذاق زندگی کو سمجھ چکا ہوں، اور اگر بالفرض کوئی سمجھ بھی چکا ہو تو مزاج و مذاق کوئی ریاضی کا فارمولا نہیں ہوتا جسے دو اور دو چار کرکے بتادیا جائے۔ وہ کوئی منطقی تعریف نہیں ہوتی جس کی تشریح پورے فوائد قیود کے ساتھ کردی جائے۔ وہ تو ایک خوشبو ہوتی ہے جو جہد و عمل کی دنیا میں کسی عظیم انسان کی اداؤں سے پھوٹتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس سے مشامِ جاں کو معطر تو کرسکتا ہے لیکن لفظ بیان کے ذریعے اس کی جامع و مانع تعریف انسانی قدرت سے باہر ہے، اس لئے اس مذاق زندگی کو بھی کماحقہ الفاظ میں ڈھالنا ممکن نہیں، البتہ میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے مجھے تیس سال سے زائد ان کی آغوش شفقت میں گزارنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس دوران مجھے ان کے انداز زندگی کی ایک ایک ادا کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، سفر و حضر غیاب و حضور، رنج و مسرت، تنگ دستی و خوشحالی، قدر دانی و مخالفت، غرض ہر قسم کے سرد و گرم حالات میں ان کے طرز عمل کا مشاہدہ اپنے کسی استحقاق یا کوشش کے بغیر ہوتا رہا اور اس دوران ایسے ایسے واقعات نظروں کے سامنے سے گزرے جن سے حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا مخصوص مزاج و مذاق ازخود جھلکتا تھا لہٰذا اگر میں اس مذاق زندگانی کو الفاظ میں بیان کرنے پر قادر نہیں تو کم

از کم وہ واقعات ضرور بیان کرسکتا ہوں جو اس مذاق کے آئینہ دار ہیں' اگرچہ مجھے حسرت ہے کہ میں اپنی زندگی میں ان واقعات سے کوئی عملی سبق نہ لے سکا' لیکن شاید انہیں بیان کرنے کی برکت سے اس سبق کا کوئی حصہ کبھی نصیب ہوجائے اور کیا بعید ہے کہ قارئین ان سے وہ فائدہ حاصل کرلیں جو میں حاصل نہیں کرسکا۔ فرب حامل فقه غیر فقیه ورب حامل فقه الیٰ من هو افقه منه

علمی مذاق

سب سے پہلے میں وہ باتیں ذکر کرنا چاہتا ہوں جو حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے علمی مذاق سے تعلق رکھتی ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک ٹھیٹھ علمی و دینی ماحول تھا' ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہ دیوبند کے قرن اول کے طلباء میں سے تھے' اور فرمایا کرتے تھے کہ میں نے دارالعلوم دیوبند کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہاں کے شیخ الحدیث سے لے کر ایک ادنیٰ چپراسی تک ہر شخص صاحب نسبت ولی اللہ تھا۔ ہمارے دادا حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے ہم سبق تھے' فراغت کے بعد آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں فارسی و ریاضی کے استاذ کی حیثیت سے کیا گیا اور وفات تک مسلسل یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دیوبند کے ان اساتذہ میں سے تھے جن سے تین تین پشتوں نے یکے بعد دیگرے درس لیا تھا۔ دیوبند کے نہ جانے کتنے خاندان ایسے ہیں کہ دادا سے لے کر پوتے تک گھر کا ہر فرد ان کا شاگرد ہے۔ آپ حضرت گنگوہی قدس سرہ سے صرف بیعت ہی نہ تھے بلکہ ان کے عاشق زار تھے۔ حضرت والد صاحبؒ نے ان کا تذکرہ اپنے رسالہ "میرے والد ماجد" میں قدرے تفصیل سے فرمادیا ہے۔

ادھر میں اپنے دوسرے مضمون "حضرتؒ کے شیوخ و اکابر" میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت والد صاحبؒ کو بچپن میں بھی کھیل کود کا زیادہ شوق نہیں ہوا' اس کے بعد جب دوسرے بچے کھیل کود یا سیر و تفریح میں لگتے' والد صاحبؒ حضرت شیخ الہندؒ یا اپنے کسی دوسرے استاد کی مجلس میں جابیٹھتے تھے۔ پھر جب والد صاحبؒ کا رشتہ تلمذ حضرت علامہ انور

شاہ صاحب کشمیریؒ کے ساتھ قائم ہوا۔ تو جو علمی مذاق گھٹی میں پڑا ہوا تھا اسے اور جِلا ملی اور وسعت مطالعہ، تحقیق و تدقیق اور کتب بینی کا صرف ذوق ہی نہیں بلکہ اس کی نہ مٹنے والی پیاس پیدا ہوئی۔

مطالعہ کا ذوق

حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ دوپہر کو جب مدرسے میں کھانے اور آرام کا وقفہ ہوتا تو میں اکثر دارالعلوم کے کتب خانے میں چلا جاتا تھا، وہ وقت ناظم کتب خانہ کے بھی آرام کا ہوتا تھا، اس لئے ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ میری وجہ سے چھٹی کے بعد بھی کتب خانے میں بیٹھے رہیں چنانچہ میں نے انہیں باصرار اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ دوپہر کے وقفے میں جب وہ گھر جانے لگیں تو مجھے کتب خانے کے اندر چھوڑ کر باہر سے تالا لگاجائیں، چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے اور میں ساری دوپہر علم کے اس رنگا رنگ باغ کی سیر کرتا رہتا تھا۔

فرماتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے کی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو میری نظرسے نہ گزری ہو۔ اگر کسی کتاب کو میں نے نہیں پڑھا تو کم از کم اس کی ورق گردانی ضرور کرلی تھی، یہاں تک کہ جب تمام علوم و فنون کی الماریاں ختم ہوگئیں تو میں نے ان الماریوں کا رخ کیا جنہیں کبھی کوئی شخص ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ یہ "اشتات" (متفرقات) کی الماریاں تھیں اور جن کتابوں کو کسی خاص علم و فن سے وابستہ کرنا ناظم کتب خانہ کو مشکل معلوم ہوتا تھا، وہ ان الماریوں میں رکھ دیا جاتی تھیں۔ ان کتابوں میں چونکہ موضوع کے لحاظ سے کوئی ترتیب نہ تھی۔ اس لئے اس جنگل میں داخل ہونا لوگ بے سود سمجھتے تھے کہ یہاں سے کوئی گوہر مطلوب حاصل کرنا تریاق از عراق سے کم نہ تھا لیکن جب ساری الماریاں ختم ہوگئیں تو میں نے اشتات کے اس جنگل کو بھی کھنگالا اور اس کے نتیجے میں ایسی ایسی کتابوں تک میری رسائی ہوئی جو گوشہ گمنامی میں ہونے کی بناء پر قابل استفادہ نہ رہی تھیں۔

کتب خانے کے اس سروے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتنے وسیع و عریض کتب خانے میں مجھے بحمداللہ یہ معلوم رہتا تھا کہ کون سی کتاب کس موضوع پر ہے اور کہاں رکھی ہے؟ چنانچہ بسا اوقات جب ناظم کتب خانہ کسی کتاب کی تلاش سے مایوس ہوجاتے تو مجھ سے پوچھا کرتے

تھے کہ فلاں کتاب کہاں ملے گی؟

فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ہمیں دورۂ حدیث ہی کے سال میں اس بات کی تاکید فرمائی تھی کہ فارغ التحصیل ہوجانے کو کبھی منتہائے مقصود نہ سمجھنا' فراغت کا حاصل صرف اتنا ہے کہ اس کے بعد انسان میں قوت مطالعہ پیدا ہوجاتی ہے اور علم کا دروازہ کھل جاتا ہے' اب یہ فارغ ہونے والے کا کام ہے کہ وہ علم کی چند کلیوں پر قناعت کرنے کے بجائے اس دروازے میں داخل ہو اور اس قوت مطالعہ کو کام میں لاکر علم میں وسعت و گہرائی پیدا کرے۔ چنانچہ فراغت کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کے زیر ہدایت ہم نے کامل دو سال کتب بینی میں صرف کئے۔

کتاب سے والد صاحبؒ کے عشق کا عالم یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں جب بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا تو ابتدائی تنخواہ پندرہ روپیہ ماہانہ مقرر ہوئی اور جب ۱۳۶۲ھ میں آپ نے دارالعلوم سے استعفیٰ دیا تو اس وقت ترقی ہوتے ہوتے پینسٹھ روپیہ ماہانہ تک پہنچے تھے' اس تنخواہ کے ساتھ آپ نے اپنا جو ذاتی کتب خانہ جمع کیا وہ تقریباً بارہ طویل و عریض الماریوں میں سماتا ہے' چنانچہ ایک عالم دین کو تصنیف اور فتویٰ کے لئے جن بنیادی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ حضرت والد صاحبؒ کی اپنی ملکیت میں موجود تھیں اور جب ۱۳۶۷ھ میں آپ دیوبند سے ہجرت کرکے پاکستان تشریف لائے تو گھر کی بیشتر ضروریات وہیں چھوڑ آئے تھے لیکن وہ کتابیں جو عمر بھر کے سرمائے کی حیثیت رکھتی تھیں جس قدر ممکن ہوا ساتھ لے آئے اور بعد میں جو کتابیں رہ گئی تھیں سب سے زیادہ اہتمام ان کے منگوانے کا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شروع میں جب کہ کراچی شہر علمی اعتبار سے انتہائی نادار شہر تھا' اور یہاں کوئی بھی اچھا کتب خانہ موجود نہ تھا' والد صاحبؒ کا ذاتی کتب خانہ صرف اپنی ہی نہیں بلکہ دوسرے اہل علم کی بھی علمی پیاس بجھایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کو جب کسی مسئلے کی تحقیق کرنی ہوتی تو وہ ہمارے مکان پر تشریف لے آتے اور گھنٹوں کتابوں کی ورق گردانی کا سلسلہ رہتا تھا۔

میں نے ہمیشہ دیکھا کہ جب کبھی حضرت والد صاحبؒ کسی جگہ تشریف لے جاتے اور وہاں کچھ کتابیں نظر پڑجاتیں تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ آپ ان پر ایک نظر ڈالے بغیر گزر جائیں' اور کوئی کتاب پہلے ہی سے دیکھی ہوئی ہوتی تو خیر ورنہ کتنی ہی جلدی کا وقت ہو' اسے الٹ

پلٹ کر دیکھنا لازمی تھا۔ آخر عمر میں جب عارضہ قلب کے ساتھ ساتھ بینائی بھی کمزور ہو گئی تو بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ میرے سالہا سال اس طرح گزرے ہیں کہ مطالعے کے لئے کوشش کے باوجود وقت نہیں نکلتا تھا اور اب بیماری کی وجہ سے مصروفیات سمٹی ہیں تو آنکھوں میں مطالعے کی طاقت نہیں رہی' لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ ایسی حالت میں بھی جب کبھی میں یا کوئی اور ہاتھ میں کوئی کتاب لے کر پہنچ جاتا تو یہ پوچھتے ضرور تھے کہ "یہ کون سی کتاب ہے؟" اور کوئی نئی کتاب ہوتی تو اس کی تفصیلات ضرور معلوم فرماتے تھے۔

والد صاحبؒ دارالعلوم کے اخراجات کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور اگر ہم لوگ مدرسے میں کسی نئی ضرورت کے لئے کچھ خرچ کرنے کی فرمائش کرتے تو کافی سوچ بچار کے بعد اس کی منظوری دیتے تھے لیکن کتابوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا' مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے یا کسی اور استاد نے مدرسے کے لئے کوئی کتاب خریدنے کی فرمائش کی ہو اور حضرت والد صاحبؒ نے اس کے معاملے میں عذر فرمایا ہو' یہ تو فرمادیتے تھے کہ اس کی قیمت کے بارے میں تحقیق کرلو کہ کہاں سے سستی ملے گی؟ لیکن انکار نہیں فرمایا۔ صرف ایک کتاب ایسی تھی جسے خریدنے سے والد صاحبؒ نے مجھے منع فرمایا اور وہ تھی ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی' مجھے اس کتاب کے مطالعے کا شوق تھا' ۶۴ء میں جب حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ ہم لوگ حج کے لئے گئے تو وہاں میں نے ایک کتب خانے میں الاغانی رکھی ہوئی دیکھی اور آکر والد صاحب سے ذکر کیا اور ساتھ ہی اپنے شوق کا بھی اظہار کیا لیکن والد صاحبؒ نے اپنی عام عادت کے خلاف صاف انکار کردیا' اور فرمایا کہ : "اتنی قیمت میں یہ کتاب مدرسے کے لئے خریدنا بیکار ہے۔" وجہ تو والد صاحبؒ نے نہیں بتائی' لیکن میں اس سے یہ سمجھا کہ یہ کتاب مدرسے کے مقاصد کے لئے اتنی ضروری نہیں' اور محض ذاتی شوق کی بناء پر مدرسے کے لئے کوئی کتاب خریدنا اصول کے خلاف ہے۔

اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس کے کچھ عرصے کے بعد حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے احقر کو اپنا واقعہ سنایا کہ مجھے کتاب الاغانی کے مطالعے کا شوق تو تھا' لیکن میں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ مدرسے کے پیسے سے یہ کتاب نہیں خریدوں گا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے الاغانی کا خلاصہ مدرسہ کو ہدیتہً دے دیا اور اس طرح میرا شوق بھی پورا ہو گیا' اور عہد بھی نہیں ٹوٹا۔

جب کوئی نئی کتاب آتی تو والد صاحبؒ اسے چند روز اپنے قریب رکھتے تھے اور خواہ کتنی مصروفیات میں الجھے ہوئے ہوں اس کے معتدبہ مطالعے کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ آخر عمر میں "صحیح ابن خزیمہ" کی پہلی جلد شائع ہوئی' اور میں نے اجازت لے کر مدرسے کے لئے منگوالی جب میں اسے لے کر والد صاحبؒ کے پاس گیا تو والد صاحب کو خوشی تو بہت ہوئی کہ وہ کتاب نگاہوں کے سامنے تھی جو صدیوں سے نایاب چلی آرہی تھی لیکن ساتھ ہی آپ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور فرمایا کہ یہ نعمت اس وقت میسر آئی ہے جب بینائی جواب دینے لگی ہے اور پھر واقعہ سنایا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے پاس سنن بیہقی ؒ کا نسخہ اس وقت پہنچا تھا جب حضرتؒ کی بینائی جاتی رہی تھی' چنانچہ حضرتؒ نے اس کا کچھ حصہ تو پڑھوا کر سنا اور باقی کتاب پر صرف ہاتھ پھیر پھیر کر اپنے ذوق کی تسکین فرمائی۔ میں بھی اس وقت حضرت گنگوہی کے اس عمل کی تقلید کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔

دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوتے ہی حضرت والد صاحبؒ کو آپ کے اساتذہ نے معین مدرس مقرر کردیا تھا اور آپ کئی سال تک اسی حیثیت سے متوسط درجے کی کتب پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد آپ کو باقاعدہ مدرس بنایا گیا' آپ آخر عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ مختلف علوم و فنون سے میری دلچسپی کے مختلف ادوار گزرے ہیں' جب میں نے شروع میں دارالعلوم دیوبند میں تدریس شروع کی تو مجھے سب سے زیادہ دلچسپی ادب سے رہی اور میں طلبا کے درمیان اسی حیثیت سے مشہور ہوا' پھر کچھ عرصے کے بعد مجھے معقولات (منطق' فلسفہ اور کلام و ہیئت) کا شوق پیدا ہوا۔ اس کی بھی اونچے درجے کی کتب پڑھائیں' اور وہ میرا خصوصی موضوع بن گیا' اس کے بعد جب فتویٰ کی خدمت میرے سپرد ہوئی تو سب سے زیادہ شغف فقہ و فتویٰ سے رہا اور فقہ کے ساتھ یہ خصوصی تعلق اتنا دیرپا ثابت ہوا کہ اب تک لوگ اسی حیثیت سے پہچانتے ہیں لیکن آخر عمر میں والد صاحب کو سب سے زیادہ ذوق اور سب سے زیادہ شغف علم تفسیر کے ساتھ ہو گیا تھا' اور فرمایا کرتے تھے کہ دل یوں چاہتا ہے کہ اسی ذوق میں عمر تمام ہو جائے' اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری فرمائی اور قرآن کریم ہی آپ کا آخری محور فکر ثابت ہوا۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام علوم و فنون کے بارے میں حضرت والد صاحبؒ کے خصوصی مذاق اور ان سے متعلق جو اصولی ہدایات آپ سے سنی یا آپ کے طرز

عمل میں دیکھی ہیں' ان کے بارے میں کچھ عرض کروں۔

ادب

جیسا کہ میں نے عرض کیا' ادب پہلا وہ موضوع تھا جس سے حضرت والد صاحب ؒ کو خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی' اس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ کی عربی تعلیم کا آغاز شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس سرہ کے ہاتھوں ہوا' اور ان کے حُسنِ تعلیم و تربیت نے آپ کو مختصر سی مدت میں اس حیرت انگیز مقام تک پہنچادیا کہ نفحۃ الیمن پڑھنے کے دوران آپ نے عربی میں اشعار کہنے شروع کردیئے تھے' ادھر دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ جو عربی کے بلند پایہ ادیب تھے' آپ پر بہت مہربان تھے اور پڑھنے ہی کے زمانے میں وہ آپ کے ادبی مذاق کو ترقی دینے کی کوشش کرتے رہے کبھی آپ سے کوئی مضمون لکھوالیا' کبھی کسی جلسے میں آپ کو سپاسنامہ لکھنے یا خیر مقدمی نظم کہنے کا حکم دیا' اس طرح آپ کی مشق سخن میں اضافہ ہوتا چلا گیا' پھر حضرت شاہ صاحب ؒ کے زیر صدارت "نادیۃ الادب" کا جو ہفتہ وار اجتماع ہوتا اس میں والد صاحب ؒ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

آپ کی تدریس کی ابتدا بھی عربی صرف و نحو اور ادب سے ہوئی' اسی دوران آپ نے نفحۃ الیمن کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا جو شائع ہوچکا ہے' سالہا سال آپ نے مقامات حریری دیوان متنبی' حماسہ اور سبعہ معلقہ کا درس دیا۔ خاص طور سے آپ کا مقامات حریری کا درس اتنا مشہور ہوا کہ دوسرے مدارس سے مدرسین اس درس میں شرکت کے لئے آیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ حضرت والد صاحب ؒ کا معمول یہ تھا کہ جو کتاب بھی پڑھاتے تھے' مطالعے کے دوران صرف اسی کے حواشی و شروح پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس علم وفن کی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کرکے اس علم کے مزاج کو پہچاننے کی کوشش کرتے تھے' چنانچہ مذکورہ کتب کی تدریس کے دوران آپ نے مختلف شعراء کے دواوین' ادب عربی کی تاریخ اور ادب کی بنیادی کتابوں کو مطالعے میں رکھا جس کی وجہ سے آپ میں عربی ادب بالخصوص عربی شاعری کا بڑا ستھرا مذاق پیدا ہوگیا تھا۔

والد صاحبؒ کو مختلف شعرائے عرب کے اتنے اشعار یاد تھے کہ انہیں سن کر حیرت ہو جاتی تھی، عربی سے واقفیت کے بعد احقر کو تقریباً بیس سال حضرت والد صاحبؒ کی آغوش شفقت میں میسر آئے اور مختلف مواقع پر آپ سے بیشمار عربی اشعار سنے، اس کے باوجود آخر عمر میں آپ کی زبان سے بسا اوقات ایسے اشعار سننے میں آتے تھے جو پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ شعرائے جاہلیت میں خاص طور سے امرأ القیس، زہیر اور اعشٰی کے، شعرائے اسلامیینؔ میں حضرت حسانؓ کعب بن زہیرؓ ذوالرمیۃ فرزدق اور حماسیّین کے اور شعرائے مولدین میں متنبیؔ ابوتمام اور ابوالعتاہیہ کے اشعار آپ سے بہ کثرت سنے جن سے ان شعراء کے ساتھ خصوصی مناسبت کا اندازہ ہوتا تھا۔

احقر نے اندازہ لگایا کہ حضرت والد صاحبؒ کو تین قسم کے اشعار خاص طور پر زیادہ پسند آتے تھے سب سے زیادہ تو وہ اشعار جن میں کوئی حکمت کی بات خوبصورتی سے کہی گئی ہو، مثلاً متنبیؔ کی مبالغہ آرائی اور اس کا انداز تشبیب و مدح سرائی والد صاحبؒ کو پسند نہ تھا لیکن چونکہ اس کے یہاں حکمت بہت زیادہ ملتی ہے۔ اس لئے اس کے بہت سے اشعار آپ کی نوک زبان پر رہتے تھے۔ آپ سے بارہا سنے ہوئے متنبیؔ کے اشعار اس وقت بھی آپ کے لہجے کے ساتھ یاد آگئے۔

ومن نكد الدّنيا على الحرّ أن يرى
عدوًّا له ما من صداقته بدّ،

ومن صحب الدنيا طويلا تقلبت
على عينه حتى يرى صدقها كذبا

الأمر لله رب مجتهد!
ما خاب إلّا لأنّه جاهد

ومتّق والسهام مرسلةٌ
يحيد من حابض إلى صارد

اذا رایت نیوب اللیث بارزۃ
فلا تظنن ان اللیث یبتسم

دوسرے وہ اشعار والد صاحبؒ عام طور پر پسند کرتے تھے جن میں سوزو گداز پایا جاتا ہو، مثلاً تنہائی کے دوران میں نے بارہا والد صاحبؒ کو یہ اشعار نہ صرف پڑھتے بلکہ پُرسوز و ترنم سے پڑھتے سنا۔

فلیت عشیات الحمیٰ برواجعٌ
علیک، ولکن خلّ عینیک تدمعا
تلفّتّ نحو الحیّ حتّیٰ وجدتنی
وجعت من الاصغاء لیتاً اخدعا

تنہائی میں ان اشعار کو پڑھنے کا انداز یہ بتاتا تھا کہ یہ شعر محض برائے شاعری نہیں پڑھے جارہے، بلکہ ان کے پس منظر میں یادوں کا ایک جہاں خوابیدہ ہے، اور اب میں سوچتا ہوں کہ دیوبند اور تھانہ بھون کے مناظر کی نہ جانے کتنی پُرسوز یادیں تھیں جو اباجیؒ کے لبوں پر یہ اشعار لے آیا کرتی تھیں۔

پُرسوز اشعار کا اثر بھی والد صاحبؒ کے دل پر بہت ہوتا تھا، آج سے تقریباً ساڑھے تین سال پہلے ہی کی بات ہے کہ جب والد صاحبؒ نے آخری عمرہ کیا تو برادران گرامی مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی اور جناب محمد ولی رازی صاحب کے علاوہ احقر بھی ساتھ تھا، مدینہ طیبہ جاتے ہوئے ہم نے مکہ مکرمہ کی شارع الحجون پر افطار کیا، میں نے شارع الحجون کا بورڈ دیکھا تو والد صاحبؒ سے عرض کیا کہ یہ وہی حجون معلوم ہوتا ہے جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے کہ ۔

کأن لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیس ولم یسمر بمکۃ سامرٌ

والد صاحبؒ نے اس کی تصدیق کی اور بتایا کہ حجون دراصل ایک پہاڑ کا نام ہے جو

لے "اس حسین چراگاہ کی شامیں تو اب تیرے پاس لوٹ کر آنے والی نہیں، بس اب تو اپنی آنکھوں کو آنسو بہانے کیلئے چھوڑ دو۔" اور "میں اپنے قبیلے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا ہی رہا، یہاں تک میری گردن کی رگیں درد کرنے لگیں۔

کسی زمانے میں مکہ مکرمہ کا آخری سرا سمجھا جاتا تھا' مکہ مکرمہ کے ایک طرف کوہ صفا تھا اور دوسری طرف کوہ حجون۔

بات آئی گئی ہوگئی' عمرہ و زیارت کے بعد والد صاحبؒ اور دونوں بھائی صاحبان تو واپس کراچی چلے آئے لیکن مجھے چونکہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ کے ساتھ افریقہ جانا تھا' اس لئے میں وہیں رک گیا' والد صاحبؒ کو جدہ ایئرپورٹ پر رخصت کرنے کے بعد میری جو حالت ہوئی اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے' اس وقت مجھ سے چوبیس گھنٹے کے لئے بھی والد صاحبؒ کی جدائی برداشت نہیں ہوتی تھی' پھر اتفاق سے رخصت کے وقت ان کی طبیعت بھی ناساز تھی' اس لئے دل کسی وقت ان کے دھیان سے خالی نہ تھا' مکہ مکرمہ واپس آیا تو حرم شریف کے سوا کہیں سکون نہ ملتا تھا۔ جو وقت حرم شریف میں گزر جاتا وہ تو پرسکون گزرتا' لیکن باہر آنے کے بعد والد صاحبؒ کی یاد اور انکی ناسازیٔ طبع کے خیال سے سخت بے چینی رہتی' اس حالت میں' میں نے والد صاحبؒ کو جو خط لکھا' اس میں اپنی حماقت سے دو شعر بھی لکھ دیئے' میں نے لکھا کہ آپ کو ہوائی اڈے پر رخصت کرنے کے بعد اس شعر کا صحیح مطلب سمجھ میں آیا کہ ؎

هوای مع الرکب الیمانین مصعدٌ
جنیب وجثمانی بمکّة موثق

اور حجون میں جس شعر کا ذکر آیا تھا' خدا جانے شاعر نے کس سیاق میں کہا ہوگا' لیکن مجھے تو اپنی حالت کی تصویر معلوم ہوتا ہے کہ ؎

کأن لم یکن بین الحجون الی الصّفا [1]
انیس ولم یسمر بمکّة سامر

میں اعتراف کرتا ہوں کہ والد صاحبؒ کو یہ اشعار لکھ کر میں نے چند در چند وجوہ کی بناء پر حماقت کی تھی' لیکن وہ وارفتگی کا ایسا عالم تھا کہ اس کے حماقت ہونے کا احساس نہ ہوسکا۔ چنانچہ جب نیروبی میں مجھے اطلاع ملی کہ والد صاحب دل کے شدید دورے کی بناء پر ہسپتال میں داخل ہوگئے ہیں' اور میں بھاگ دوڑ کر کراچی پہنچا تو ایک دن اباجیؒ نے فرمایا کہ

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجون سے لے کر صفا تک نہ میرا غمگسار کبھی موجود تھا' اور نہ مکہ کی چاندنی راتوں میں میرے ساتھ کسی نے کبھی باتیں کی تھیں۔

"تم نے خط میں دو شعر ایسے لکھ دیئے تھے جیسے وہ اسی موقع کے لئے کہے گئے ہوں۔" یہ فرما کر ابا جی کی آنکھوں میں خفیف سے آنسو آگئے اور آواز بھرا سی گئی لیکن اللہ رے رعایت حقوق کہ ساتھ ہی فرمایا : "مگر مکہ مکرمہ کے لحاظ سے وہ موزوں نہ تھے۔"

اب میں اس زمانے کے بارے میں سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص کی زندگی صرف پندرہ دن کے لئے اپنے والد سے جدا ہونے کے بعد اتنی اجیرن ہو جاتی تھی، آج دو سال سے زیادہ جدا رہنے کے بعد وہ کس طرح زندہ ہے؟........ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا پراسرار نظام ہے، وہ جب کوئی غم دیتا ہے تو اسے برداشت کرنے کی قوت بھی عطا فرماتا ہے۔ اس روئے زمین پر یقیناً سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے بڑا نہ کوئی حادثہ رونما ہوا ہے اور نہ اس سے بڑا کوئی صدمہ کسی کو پیش آسکتا ہے لیکن وہی صدیق اکبرؓ عمر فاروقؓ عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ جو آپ کی حیات طیبہ کے صرف ایک سانس کے بدلے ہزاروں زندگیاں نچھاور کر سکتے تھے۔ اس پہاڑ جیسے صدمے کے باوجود زندہ رہے، یہ تو اس حیّ و قیوم کا بنایا ہوا نظام ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو دنیا کبھی کی ویران ہو چکی ہوتی۔

بات خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گئی، کہہ یہ رہا تھا کہ والد صاحبؒ کے شعری مذاق کو سوز و گداز والے اشعار زیادہ پسند آتے تھے اور ان سے آپ کو تاثر بھی ہوتا تھا۔

والد صاحبؒ کے مذاق شعر میں تیسری پسندیدہ چیز سادگی، بے تکلفی، برجستگی اور کسی شعر کا سہل ممتنع ہونا تھا، مثلاً عربی کے چند اشعار جو والد صاحبؒ کو بے حد پسند تھے اور جب کبھی شاعری میں حسن ادا کی بات چلتی تو عام طور پر انہیں لطف لے کر سنایا کرتے تھے، اس وقت یاد آگئے۔

جعفر بن علبہ حارثی کے بارے میں والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے رزم کو بے ساختہ گفتگو کی زبان میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں برجستگی روانی اور بے تکلفی کے باوجود رزمیہ شاعری کی پوری شوکت بھی برقرار ہے۔ ایک مرتبہ اس کے دشمن نے اسے پوری طرح گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرنا چاہا تھا۔ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اس نے کہا ہے ؎

فقالوا لنا: ثنتان لابد منهما صدور رماح اشرعت او سلاسل
فقلنا لهم: تلكم اذاً بعد كرّة تغادر صرعىٰ نوءها متخاذل

ولم ندر ان حضنا من الموت حیضة کم العمر باق والمدی متطاول
اذا ما ابتدرنا مأزقاً فرجت لنا بأیماننا بیض جلتها الصیاقل

والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایک طرف تو ان اشعار کی برجستگی کا عالم یہ ہے کہ ان کی نثر کرنا مشکل ہے اور دوسری طرف ان میں رزمیہ شاعری کا پورا زور موجود ہے۔

اسی طرح حماسہ کے باب المراثی میں ایک ایسے باپ کے کچھ اشعار آتے ہیں جس کی بیوی ایک چھوٹا سا بچہ چھوڑ کر مر گئی تھی، یہ بے چارہ بڑے مشقت کے ساتھ اسے پالتا رہا، یہاں تک کہ ایک روز وہ بچے کو گھر چھوڑ کر کہیں باہر گیا، واپس آ کر دیکھا تو وہ بھی ایک بالاخانے سے گر کر مر چکا تھا، اس پر اس نے اس نے مرثیے کے چند اشعار کہے ہیں جو والد صاحبؒ کو بہت پسند تھے اور چونکہ ان اشعار میں سوز و گداز اور برجستگی و بے تکلفی دونوں اپنی انتہا پر ہیں، اس لئے والد صاحبؒ ان کی بے حد تعریف کرتے تھے، وہ کہتا ہے۔

هوی ابنی من علا شرفٍ یهول عقابه صعده
هوی من رأس مرقبة ففتّت تحتها کبده
هوی عن صخرة صلدٍ ففرّت تحتها کبده
فلا امّ فتبکیه ولا اختٌ فتفتقده
اُلام علی تبکیه والمسه فلا اجده
وکیف یلام محزون کبیر فاته ولده

فارسی میں حضرت والد صاحبؒ کو سعدیؒ، حافظ شیرازیؒ مولانا رومیؒ اور عرفی و نظیری کے اشعار کافی یاد تھے اور خاص طور پر مولانا جامیؒ اور مولانا رومیؒ سے بڑی مناسبت تھی، مثنوی تو آپ کو اتنی زیادہ یاد تھی کہ عام طور سے تقریروں میں بھی اور گفتگو میں بھی مناسبت سے اس کے طویل طویل اقتباسات سناتے چلے جاتے تھے۔ والد صاحبؒ کے ذاتی کتب خانے میں کلیات جامیؒ موجود ہے اور اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شاید اس کا باستیعاب مطالعہ کیا ہے اور اپنے پسندیدہ اشعار پر نشان لگا دیئے ہیں، ان میں سے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمایئے، جن سے والد صاحبؒ کے بلند پایہ مذاق کا اندازہ ہو گا۔

هر سجده که در عمر خود آرد همه سهواست
عابد که بجز ابروئے تو محراب گرفتست

چودر نظارہ آں روئے می تواں مردن
مرا ہزار شکایت زجان خویشتن است

اے فلک اندوہ شیریں بردل خسرومنہ
کایں بضاعت را خریدارے بہ از فرہاد نیست

شداز حقائق عرفاں دلم خزینۂ راز
گزاف فلسفیاں کے بہ نیم فلس خورم

یک طرف بانگ حدی یک جانب آوازدرائے
از گراں جانی بود آنرا کہ ماند دل بجائے

نجدمی گویم وزاں قصدم زمین یثرب است
کافتاب جوُد وخورشیدِ کرم را مغرب است

اردو شاعری سے اگرچہ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ربط نسبتًہ کم رہا، لیکن حسن ذوق کسی زبان کے ساتھ خاص نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے آپ نے اردو اشعار کا بھی مطالعہ فرمایا، اور اردو شعراء میں خاص طور پر اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، حضرت مجذوبؒ، اکبر الہ آبادی اور اقبال آپ کو پسند تھے، اور ان کے بہت سے اشعار آپ کو یاد بھی تھے، بالخصوص اکبر الہ آبادی کی تو شاید پوری کلیات کا آپ نے مطالعہ فرمایا تھا، چنانچہ ان کے صرف طنزیہ اشعار ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیات کے چیدہ اشعار بھی مختلف تقریروں میں آپ کی زبان پر آجاتے تھے۔ حضرت والد صاحبؒ کی ذاتی بیاض میں ایک حصہ "حکمتہ الاشعار" کے نام سے ہے جس میں اپنے پسندیدہ اشعار درج فرمائے ہیں، اس کا کچھ حصہ حضرت والد صاحبؒ کی کتاب "کشکول" میں بھی شائع ہوچکا ہے۔

حضرت والد صاحبؒ نے شعرو شاعری کو اپنا باقاعدہ مشغلہ کبھی نہیں بنایا لیکن چونکہ ذوق شعر ایک فطری وصف کے طور پر آپ کو عطا ہوا تھا، اس لئے کبھی فرصت کے اوقات

میں بے ساختہ کچھ اشعار موزوں ہو جاتے تھے، جنہوں نے رفتہ رفتہ ایک مکمل بیاض کی صورت اختیار کر لی۔ اکابر علماء دیوبند میں سے بیشتر حضرات کا یہی حال تھا کہ اگرچہ انہوں نے شعر و ادب کو اپنا باقاعدہ موضوع کبھی قرار نہیں دیا، لیکن فطری طور پر شعر گوئی کے مذاق سے حضرت مولانا نانوتوی رحمتہ اللہ سے لے کر حضرت تھانویؒ تک تقریباً سبھی کو حصہ وافر ملا تھا۔

حضرت والد صاحبؒ نے اپنے فارسی اور اردو اشعار اپنی کتاب "کشکول" کے دوسرے حصے میں شامل فرمادیئے ہیں اور ان کے پیش لفظ میں جو ایک صفحہ لکھا ہے وہ شعر و شاعری کی حقیقت واضح کرنے کے لئے طویل مقالوں پر بھاری ہے، فرماتے ہیں :

"شعر ہر سلیم الطبع انسان کا فطری ذوق ہوتا ہے، اس سے بہت سے اچھے کام بھی نکلتے ہیں جو نثر عبارت سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ انسان کی طبیعت کو کسی خاص چیز پر آمادہ کرنے کے لئے شعر بڑا کام کرتا ہے، مگر وہ دو دھاری تلوار ہے۔ اپنی حفاظت کا سامان بھی بن سکتی ہے۔ اور ہلاکت کا بھی۔

دنیا میں عام معاملات کی طرح اس میں بھی بڑی افراط و تفریط ہوتی چلی آتی ہے بہت سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے سارا علم و ہنر شعر و سخن ہی کو قرار دے کر اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر چھوڑی اور پھر اس دریا میں ایسے غرق ہوئے کہ حلال و حرام اور نیک و بد کا بھی امتیاز نہ رہا، اور بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کو ایک شجرہ ممنوعہ سمجھتے ہیں۔

صحیح اور معتدل تعلیم وہ ہے جو اس کے متعلق حکیم الحکماء امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے دی ہے کہ شعر اپنی ذات میں نہ اچھا ہے نہ برا بلکہ نثر کلام کی طرح اپنے مضمون اور مقصود کے اعتبار سے اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔

احقر ناکارہ نے کبھی شعر و سخن کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا، نہ اس کو باقاعدہ سیکھنے کی کبھی کوشش کی اور نہ کبھی ضروری مشاغل نے اتنی فرصت دی کہ اس کام میں دخل دیا جائے، میرے نظم لکھنے کی ابتداء

عربی ادب کے سلسلے میں استاذ محترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب
رحمتہ اللہ علیہ کے ارشاد کی بنا پر ہوئی' جب کہ دارالعلوم کے طلباء
کچھ اردو زبان کے مشاعرے جمعہ کی فرصت میں منعقد کیا کرتے تھے تو
استاذ محترم نے ہم چند طلباء کو غیرت دلائی کہ اگر شعر کہنا ہے تو عربی
میں کہو جو تمہارے مقصد تعلیم میں معین ہو۔ اس وقت سے عربی میں
مختلف قسم کے اشعار و قصائد لکھنے کی نوبت آئی' اور پھر جب یہ ذوق
کچھ آگے بڑھا تو ترقی معکوس یہ ہوئی کہ فارسی زبان میں اور پھر اردو
زبان میں کچھ اشعار' قطعات' غزل' قصیدے لکھنے کی نوبت آئی۔"

حضرت والد صاحبؒ کے اشعار میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے بھی ترتیب کچھ اسی طرح معلوم ہوتی ہے کہ عربی اشعار پہلے نمبر پر ہیں' پھر فارسی اور پھر اردو کا نمبر آتا ہے۔ میرے لئے حضرت والد صاحبؒ کے اشعار کی تعریف کرتے ہوئے ہمیشہ حافظ ابن حجر کا ایک مقولہ رکاوٹ بنتا ہے جو خود والد صاحبؒ ہی سے بارہا سنا تھا کہ :

من مدح بغیر فنہ فقد وقص

کسی شخص کی تعریف اس کے اصلی فن کے علاوہ کسی اور چیز میں کرنا گویا اس کی گردن توڑ دینا ہے۔

حضرت والد صاحب کا اصلی فن دینی علوم تھے' اس لئے ڈر رہتا ہے کہ شعرو شاعری میں ان کی مدح سرائی کہیں اس مقولے کی زد میں نہ آجائے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مقولے کا صحیح مصداق وہ صورت ہے جس میں کسی کی تعریف اس کے اپنے فن میں تو کی نہ جائے اور صرف کسی دوسرے معاملے میں کی جائے' اور میں نے جس ترتیب کے ساتھ یہ تذکرہ شروع کیا ہے۔ وہ میں شروع میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ چونکہ ابتداء ہی میں آپ کو خصوصی دلچسپی ادب سے ہی رہی ہے۔ اس لئے علمی مذاق کا آغاز اسی سے کیا ہے ورنہ در حقیقت آپ کے اصل موضوعات کا بیان آگے آنے والا ہے' لہذا اگر ایک اضافی خصوصیت کے لحاظ سے آپ کے اشعار کی کوئی خوبی بیان کردی جائے تو غالباً مذکورہ مقولہ اس پر صادق نہیں آئے گا۔

والد صاحب کے عربی اشعار کا ایک مجموعہ "نفحات" کے نام سے شائع ہوچکا ہے' والد

صاحبؒ نے عربی زبان میں کئی کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں۔ مضامین بھی لکھے ہیں اور شعر بھی کہے ہیں۔ اگرچہ آپ نہ صرف عربی تحریریں بے تکلف لکھا کرتے تھے بلکہ اس معاملے میں اپنے معاصر علماء کے درمیان ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ اس کے باوجود اگر میں آپ کی عربی نثر کی زیادہ تعریف کروں تو اس میں مبالغے کا اندیشہ ہے۔ لیکن آپ کے عربی اشعار کے بارے میں کسی خوف کے بغیر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ اگر کہنے والے کا نام لئے بغیر انہیں کسی صاحب ذوق کے سامنے رکھا جائے تو وہ بلا تأمل یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ اشعار اسلامیین یا مولدین میں سے کسی عرب شاعر کے ہیں مثلاً "نادیۃ الادب" کے ایک طرحی مشاعرے میں والد صاحبؒ نے جو اشعار پڑھے، ان کے یہ تیور ملاحظہ فرمائیے ؎

ترحّل عنی الصبر یوم ترحّلوا
فبتّ بقلب فی الحشا یتململُ
یقول نصیحی فی ھواہ توجعًا
"تعزّ فإنّ الصبر بالحرّ اجملُ"
یصبّرنی؟ والصبر عین شکیتی
وما غالنی فی الحبّ الاّ التجمّلُ

ان اشعار کو اور بالخصوص آخری شعر کو پڑھ کر کون اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ کسی عجمی شاعر کا شعر ہوگا؟ اسی قصیدے کا ایک اور شعر یاد آیا ؎

بکینا فأبکینا ولا مثل ناقف
لحنظلۃ فی الحیّ یوم تحمّلوا

اس شعر میں والد صاحبؒ نے امرؤ القیس کے اس شعر پر لطیف چوٹ کی ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ ؎

کأنّی غداۃ البین یوم تحمّلوا
لدی سمرات الحیّ ناقف حنظلِ

لیکن خود والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے امرؤ القیس کے اس شعر پر تعریض تو کردی ہے مگر سوز و گداز اور لطافت و نزاکت کے اعتبار سے شعر امرؤ القیس ہی کا بہت

بھاری ہے اور میری تعریض کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے سوداؔ نے میرؔ پر تعریض کی تھی میر کا شعر تھا۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو

ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سوداؔ کو یہ شعر سنایا گیا تو اس نے کہا کہ : "یہ کیا زنانہ قسم کا شعر ہے" اور پھر اس مضمون کو خود اس طرح ادا کیا۔

سوداؔ کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت

خدام ادب بولے "ابھی آنکھ لگی ہے

اس طرح ایک اور طرحی قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

شیم اللیالی أن تریتی بدرها

والعین غیر بدورها یرتاد

لعب النسیم ببانة فتشابها

قدّ الحبیب وغصنها المیّاد

أعیا سقیمُهم الرقاة وعندهٗ

مرض الطبیب وعیدت العوّاد

اور ایک نعتیہ قصیدے کے یہ اشعار۔

من ذکر طیبة مغداها فمسا ها

جرت شئونی ، بسم اللہ مجراها

أتی فردّ قلوبا عن غوایتها غلفا عن الحق، غین الکفر غشاها

نادیٰ ، فسمّع آذانا بها صمم جلّیٰ ، فأعین عمی الخلق جلّاها

واهًا الطیبة لا زالت منوّرة طابت مشارقها من طیب ریّاها

من للشفیع باسحار بها سلفت وعیشةٍ فی حوالیها تملّاها

اور ایک عارفانہ غزل کے چند اشعار۔

أشاقك من ليلاك طيف خيالها ... وقد حالت الأجبال دون وصالها
مهامه تنضى الخيل دون هضابها ... مقابر للآمال دون طلالها
مداولة الأيام فى الناس دائب ... فأبصر مآل الكائنات بحالها
وهاتف حق كل كون وكائن ... بأعلى نداء ان صغيت لقالها
ظهور جمال الحق اورثه الخفا ... به ضلت الأقوام، بالضلالها

اور عمر رفتہ کا ایک مرثیہ۔

دعيني عنك يا سعدى دعيني ... وبيني عن فؤادى ثم بيني
وما سرت يداى بجيد خود ... وما دل الخرائد يزدهيني
أبان الشيب، رب، سواد شعرى ... فهل لسواد وجهى من مبين

يا ربّ نفسى فى الأهواء أهوى بى ... ولو صبرت لكان الصبر أولى بى
يا رب فاكف هموما لى أكابدها ... واجعل لنفسك تطوافى وتطلابى
أنت الولى إذا ولى الولاة غدًا ... وأسلمت جسدى للترب أترابى
فإن طردت، وذاك العدل يا صمدى ... فما لعبدك فيما بعدُ من باب

اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے مرثیے میں یہ شعر۔

أى الخطوب من الأيام أبكيه ... والدهر ذو إحن لا يأتلى فيه
كتمت دائى حتى عيل مصطبرى ... وليس منكتما ما الله مبديه
جرت بسرى أقلام الجفون على ... صفيحة الوجه والأحزان تمليه

یہ اور اس نوع کے بہت سے اشعار بلا شبہ ایسے ہیں کہ ان کے مضامین سے لے کر ان کے اسلوب بیان اور ان کی زبان تک کہیں عجمیت کی کوئی بو محسوس نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ یمن کے کسی ادیب نے حضرت والد صاحبؒ کا کوئی قصیدہ کسی رسالے میں دیکھا تو بے ساختہ یہ سمجھا کہ یہ کسی پختہ مشق عربی شاعر کا قصیدہ ہے لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ اشعار ایک ہندوستانی عالم کے ہیں تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی' اس نے والد صاحبؒ کو خط لکھا اور پھر ملاقات کے لئے سفر کر کے پہنچا۔

فارسی اشعار

والد صاحبؒ نے فارسی زبان میں بھی شعر کہے ہیں جو "کشکول" میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کا نمونہ دیکھنا ہو تو یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے :

تا بکے شکوۂ ایں گردش ایام کنی
واندریں فکر بسر کے سحروشام کنی
اے دل آں بہ کہ نظر بازبر انجام کنی
رو زدنیائے دنی سوئے دلآرام کنی
گوش برچنگ نہی، نغمۂ مطرب شنوی
خاک برگردش دہرو غم ایام کنی
حکم عقل است کہ چوں برسر خرمن گزری
پیش ازدانہ نظر برطرف دام کنی
نیک نامی ز عزیزان جہاں نیست امید
بہ کہ بیروں زسرت ایں ہوس خام کنی

دیوانہ خوشتر است نہ فرزانہ خوشتراست
کانزاکہ خواست جلوۂ جاناں نہ خوشتراست
دیدی کہ رنج ہائے جہاں راکنارہ نیست
پس بامنے بگوشۂ میخانہ خوشتراست
تنگ آمدم زصحبت یاران ایں زماں
بس مونسم صراحی وپیمانہ خوشتراست
خوش درس علم وشغل فتاویٰ بدیوبند
لیکن شبے بہ خانقہِ تھانہ خوشتراست

بگذر زمن کہ حالت زارم نہ دیدہ بہ
بگذار حال من کہ ہمیں ناشنیدہ بہ
ناکندنی ست دررہ محبوب خارپا
کیں خار عشق دررگ جانم خلیدہ بہ
چشمم اگر بصبح نہ بیند جمال دوست
گویم کہ صبح تابہ ابد نادمیدہ بہ
اے چارہ گر بخیز! کہ بیمار عشق را
جاں سوختہ طپیدہ ونا آرمیدہ بہ
ہم بخیہ سازیے نہ سزد بہر دامنش
کیں گل سدا بہار گریباں دریدہ بہ

مجھے یاد ہے کہ دارالعلوم جب ابتداء میں شرافی گوٹھ کے قریب(جہاں اب کورنگی کالونی آباد ہو گئی ہے) قائم کیا گیا تو ایک مرتبہ جناب جگر مراد آبادی مرحوم، ادیب سہارنپوری مرحوم، جناب ماہرالقادری مرحوم دارالعلوم تشریف لائے، رات کے وقت شعروسخن کی محفل منعقد ہوئی، اس محفل میں برادر محترم جناب مولانا محمد زکی کیفی صاحب مرحوم نے حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے فارسی کلام میں سے موخرالذکر دو غزلیں ان حضرات کو سنائیں، جناب جگر مرحوم ان غزلوں کو سن کر ایک ایک شعر پر وجد کے ساتھ حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ ایک بوریہ نشیں عالم دین نے، جس کی ساری عمر قرآن وحدیث اور فقہ وفتویٰ کی خدمت میں بسر ہوئی اور جس نے کبھی شعروسخن کو اپنا باقاعدہ مشغلہ نہیں بنایا، ایسے پختہ اور دلکش اشعار کیسے کہے ہیں؟

اردو اشعار

والد صاحبؒ کے اردو اشعار بھی "کشکول" میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں زیادہ تر نظمیں اور قطعات ہیں اور چند غزلیں بھی، غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ بزم اب کہاں وہ طرب کا سماں کہاں
ساقی کہاں وہ جام مئے ارغواں کہاں

ڈھونڈیں ہم اب نقوش سبک رفتگاں کہاں
اب گرد کارواں بھی نہیں کارواں کہاں

اور ایک ناتمام غزل کے یہ شعر جو طبع نہیں ہو سکے، کس قیامت کے اشعار ہیں :

لب پر دم اخیر ترا نام آگیا
رکتا ہوا یہ سانس بہت کام آگیا
بیمارِ عشق لے کے ترا نام سو گیا
مدت کے بے قرار کو آرام آگیا
آثار سارے صبح قیامت کے ہو گئے
محفل میں آج کون سر شام آگیا

دل میں کس کی بزم عشرت کا سماں رکھتا ہوں میں
اپنی نظروں میں جمال دو جہاں رکھتا ہوں میں
دل میں حسرت ہے، جگر میں درد پہلو میں شرر
شام تنہائی میں ساز کارواں رکھتا ہوں میں
کہہ نہیں سکتا زباں سے، دیکھتی ہے جس کو آنکھ
چشم نرگس کی تو سوسن کی زباں رکھتا ہوں میں
کنج تنہائی کی مونس، شام غربت کی رفیق
ایک تصویر خیالی حرزجاں رکھتا ہوں میں
کچھ جنوں میں میرے آمیزش ہے دانائی کی کیا
جیب وداماں کی ابھی کچھ دھجیاں رکھتا ہوں میں

اس قدر ہو گیا ہے خوگر غم
دل میں کوئی خوشی نہیں آتی
گدگدائے کوئی ہزار مگر
اب لبوں پر ہنسی نہیں آتی

تم بدلتے ہو روز قول و قرار
مجھ کو یہ دل لگی نہیں آتی
عمر رفتہ کا مرثیہ پڑھ لوں
اس سے بہتر ھُدی نہیں آتی

کس قدر تھا لذیذ خواب عدم
پر سکوں تھا جہان بے خبری
رنج وراحت کی فکر تھی کس کو
کس کو سودوزیاں کی درد سری
آہ کس کشمکش میں ڈال دیا
تو نے اے ذوق علم ودیدہ وری
جیب وداماں ہیں تار تار کبھی
اور کبھی ساز گار بخیہ گری

راز ہستی جو پا گیا ہوں میں
سارے عالم پہ چھا گیا ہوں میں
حکما جس کا راز پا نہ سکے
اس حقیقت کی ابتدا ہوں میں
میری ہستی کو سرسری مت جان
ڈور الجھی ہے اور سرا ہوں میں
آئینہ ہوں جمال مطلق کا
ایک جام جہاں نما ہوں میں

ان کے علاوہ بیشتر نظمیں اور قطعات حکمت و نصیحت کے مضامین پر مشتمل ہیں مثلاً۔

یہ دنیا اے عزیزو ایک جھولے کی سواری ہے
اترنا اور چڑھنا سب کا اس میں باری باری ہے

یہاں کی ہر خوشی ہر غم ہراک آفت ہراک راحت
بصیرت سے اگر دیکھو تو امر اعتباری ہے
حقیقت حق نے ہراک آنکھ والے کودکھا دی ہے
کسی کا غم کسی کے واسطے پیغام شادی ہے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے کلام سے اخذ کر کے حضرت والد صاحبؒ نے ''مقبرے کی آواز'' کے نام سے ایک انتہائی مؤثر نظم کہی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

مقبرے میں اترنے والے سن
ٹھہر، ہم پر گزرنے والے سن
ہم بھی اک دن زمیں پہ چلتے تھے
باتوں باتوں میں ہم مچلتے تھے

اس نظم کا یہ ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے۔

جن کو مر مر کے میں نے پالا تھا
جن کے گھر کا میں اک اجالا تھا
جن کے ہر کام کا مدار تھا میں
جن کی بگڑی کا سازگار تھا میں
دین و دنیا کی ساری مکروہات
جن کی خاطر تھی میرے سر دن رات
ہے کہاں آج وہ مری اولاد
جو نہیں کرتی بھول کر بھی یاد
جن پہ تھا کل مدار راحت کا
جس کو دعویٰ تھا کل محبت کا
جس کی الفت کا دل میں تھا اک داغ
کیا کسی گھر کا بن گئی وہ چراغ
آج وہ زینت حرم ہیں کہاں
مہبط الفت و کرم ہیں کہاں

کون آباد ہے مرے گھر میں
ملک کس کی ہے نقد وزیور میں
کوئی کرتا نہیں ہے یاد مجھے
سب نے چھوڑا ہے نامراد مجھے

ہم ہر اک رہگذر کو تکتے ہیں
فاتحہ کے لئے ترستے ہیں
اے زمیں پر مچلنے والے دیکھ
کبر ونخوت سے چلنے والے دیکھ
وعظ ہے' قبر کا نشاں میری
گرچہ خاموش ہے زباں میری
دل کے کانوں سے سن فغاں میری
درس عبرت ہے داستاں میری
جانے والے تو جا کے پھیلا دے
میری آواز سب کو پہنچا دے

حضرت والد صاحبؒ کے ایک عزیز حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندیؒ بڑے پائے کے بزرگ تھے' نزع کے وقت ان کا شیطان سے مناظرہ ہوا تھا' جس سے متاثر ہو کر حضرت والد صاحبؒ نے اپنا رسالہ "موت کے وقت" تحریر فرمایا ہے' ان کی وفات پر جو مرثیہ آپ نے کہا ہے' اس کے کچھ بند بھی پیش خدمت ہیں اس مرثیے کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے۔

کون اٹھتا ہے آج عالم سے؟
پارہ پارہ ہے کیوں جگر غم سے
خون روتا ہے کیوں افق سرِشام؟
سینہ شق ہے یہ کس کے ماتم سے
حادثہ یہ کوئی عظیم نہ ہو!
یہ کہیں رحلت نعیم نہ ہو!

پھر اظہار رنج کے کچھ اشعار کے بعد حسب معمول حکمت و موعظت کی طرف گریز ہے۔

اک کتاب عبر بہ عالم ہے
سبق آموزِ ابن آدمؑ ہے
کہیں جشن طرب کے ہنگامے
کہیں بزم • عزا وماتم ہے
ہر تغیر ہے غیب کی آواز
ہر تجدد میں ہیں ہزاروں راز
عبرتوں کے سبق ہیں لیل ونہار
اور شام وپگاہ کی تکرار
کہیں تاراج کن ہے فصل خزاں
کہیں رعنائیوں پہ فصل بہار
ہر تغیر میں عین حکمت ہے
اس میں مستور دست قدرت ہے
کل جہاں جشن تھا' تماشا تھا
شور رقص وسرود برپا تھا
آج ملتا نہیں نشاں اتنا
کون تھا؟ کس جگہ تھا؟اور کیا تھا
ذرے ذرے میں ہے جہاں کے عیاں
آیت کل من علیہا فان
کوئی حاکم ہے اور کوئی محکوم
کوئی ظالم ہے اور کوئی مظلوم
مال ودولت میں کوئی ہے مخمور
کوئی نان جویں سے بھی محروم
کوئی آقا ہے اور کوئی مزدور
کوئی گمنام' .اور کوئی مشہور

کہیں زینت میں مست ہے دلہن
کہیں میت کا سل رہا ہے کفن
ہے کہیں محفل سرود وطرب
کہیں مصروف غم ہیں مرد و زن
یہ تغیر، یہ سارے شادی وغم
زلف محبوب کے ہیں پیچ وخم
ہے کوئی تخت کے بنانے میں
کوئی تختے پہ ہے نہانے میں
کوئی لہو ولعب میں ہے مخمور
کوئی رونے میں اور رلانے میں
تجھ کو معلوم ہے، یہ سب کیا ہیں
ان میں مخفی پیام رب کیا ہیں

معقولات

ادب کے علاوہ والد صاحبؒ کو دارالعلوم دیوبند میں معقولات یعنی منطق، فلسفہ، کلام ہیئت اور ریاضی بھی پڑھانے کا موقع ملا، اور چونکہ آپ نے یہ علوم ایسے اساتذہ سے پڑھے تھے جو اپنے وقت میں معقولات کے امام سمجھے جاتے تھے، مثلاً حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزارویؒ، حضرت مولانا رسول خاں صاحب ہزارویؒ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان علوم میں بھی راسخ استعداد عطا فرمائی تھی، چنانچہ ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب دارالعلوم دیوبند کے طلباء میں آپ معقولات کے ماہر کی حیثیت سے معروف ہوئے لیکن ساتھ ہی بزرگوں کی تعلیم وتربیت اور ان کی صحبت کے اثر سے یہ حقیقت آپ کے ذہن وقلب میں پیوست تھی کہ یہ علوم ایک طرف تو مقصود بالذات نہیں بلکہ محض آلے اور وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں، اور دوسری طرف ان علوم میں اجتہاد کا باب وسیع ہے، اور ان میں فلاسفہ کے فتووں کی تقلید ضروری نہیں، چنانچہ آپ ان علوم کی تدریس کے دوران صرف کتاب کو سمجھانے پر ہی اکتفا نہیں فرماتے تھے، بلکہ زیرِ بحث

مسائل میں اپنی تحقیق بھی بیان فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند میں منطق کی مشہور کتاب "میرزاہد رسالہ" کا درس ایک استاذ کے سپرد ہوا، اور طلباء کی جماعت ایسی آگئی جس نے قدم قدم پر سوالات کی بھرمار کرکے استاذ کو زچ کردیا، بسااوقات استاذ ان غیر متوقع سوالات کے لئے تیار نہ ہونے کے سبب اطمینان بخش جواب نہ دے پاتے اور طلباء کا اطمینان نہ ہوتا، اس طرح بحث ومباحثہ کی فضا میں درس کی رفتار بھی سست ہوگئی، اور استاذ کا وقار بھی خطرے میں پڑنے لگا، اس وقت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری صاحبؒ ناظم تعلیمات تھے، جب انہیں اس صورت حال کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اساتذہ کو جمع کرکے اس بارے میں مشورہ کیا، اور رائے یہ ہوئی کہ اس کتاب کا درس کسی اور استاذ کے پاس بھیج دیا جائے، اس سلسلے میں مختلف تجویزیں زیر بحث آئیں، آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے والد صاحبؒ سے خطاب کرکے ارشاد فرمایا کہ یہ درس آپ اپنے ذمے لے لیں، حضرت والد صاحبؒ نے جواب دیا کہ :

> "حضرت! اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو درحقیقت میں میزان الصرف پڑھانے کا بھی لائق نہیں، لیکن اگر آپ اپنی سرپرستی میں پڑھوانا چاہیں تو مجھے بخاری شریف بھی دے دیں گے تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا اور اللہ کے بھروسے سے پروہ بھی پڑھاؤں گا۔"

چنانچہ وہ کتاب حضرت والد صاحبؒ کے سپرد کردی گئی، والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب میں پہلے دن درس دینے کے لئے پہنچا تو میں نے طلباء سے خطاب کرکے کہا کہ :

"مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ حضرات کو معقولات میں بہت ملکہ ہے اور اس سلسلے میں آپ کے دل میں سوالات بہت پیدا ہوتے ہیں، اس لئے میں نے یہ طے کیا ہے کہ شروع میں ایک ہفتہ صرف سوال وجواب اور مذاکرے کے لئے رکھوں گا، اس ہفتے میں جس کسی کے دل میں کوئی سوال ہو وہ بلا تکلف بیان کردے، اور جب تک اطمینان نہ ہوجائے، آگے نہ بڑھے، البتہ گفتگو کے دوران یہ بات ذہن میں رکھے کہ موضوع بحث معقولات ہیں لہٰذا گفتگو کی بنیاد خالص عقلی دلائل پر ہوگی، اور محض اس بات کو دلیل نہیں سمجھا جائے گا کہ فلاں منطقی یا فلاں فلسفی نے یہ بات لکھی ہے بلکہ جو بات کہی جائے گی وہ عقلی دلائل کی بنیاد پر کہی جائے گی۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن میں نے جو قید لگادی تھی کہ کسی منطقی یا فلسفی کے قول کو حجت کے طور پر پیش نہ کیا جائے، اس کی بنا پر طلباء کی ترکی جلد ہی تمام ہوگئی، اور ایک ہفتہ تو درکنار، ایک دو دن ہی میں سارے سوالات ختم ہوگئے اس کے بعد میں نے حسب معمول درس شروع کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ طلباء مطمئن ہوگئے۔

معقولات کی تدریس میں جب انہماک زیادہ ہوجائے تو بعض اوقات یہ حقیقت نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے کہ ان کو پڑھنا پڑھانا بذات خود مقصود نہیں بلکہ منطق تو محض آلہ ہے اور فلسفہ اس لئے پڑھایا جاتا ہے کہ ایک عالم دین کو ان نظریات کا صحیح علم ہو جو دین کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں، اور پھر وہ ان کی مؤثر تردید کرسکے لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ نے جب بھی منطق یا فلسفہ کا درس دیا، یہ حقیقت طلباء کے ذہن نشین کرادی کہ ان عقلیات میں بذات خود کچھ نہیں رکھا ہے، اور اگر انسان کو وحی الٰہی کا نور ہدایت حاصل ہو تو وہ ان عقلی گھوڑوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوسکتا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ جس طرح ہمارے قدیم متکلمین نے یونانی فلسفے میں مہارت حاصل کرکے اس کی تردید فلسفیانہ زبان ہی میں کی تھی، اسی طرح موجودہ دور کے علماء کو جدید فلسفے میں مہارت حاصل کرکے وہی کام از سر نو انجام دینا چاہیے۔ اس غرض کے لئے آپ نے حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے جدید فلسفے کا بھی درس لیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے بعد آپ کی خصوصی مصروفیات کا محور فقہ اور تفسیر وغیرہ رہے، اس لئے اس میدان میں آپ کو خود کوئی نمایاں کام کرنے کا موقع نہیں ملا، البتہ آپ کی خواہش یہ ضرور تھی کہ ایسے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہوں جو جدید فلسفے پر مکمل دسترس حاصل کرکے عہد جدید کا نیا "تہافۃ الفلاسفہ" تصنیف کرسکیں اور اسی مقصد سے آپ نے دار العلوم کے نصاب تعلیم میں جدید علم کلام کی بعض کتب کا اضافہ فرمایا تھا۔

حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ بزرگان دیوبند نے اپنی زیادہ تر توجہ تفسیر، حدیث اور فقہ جیسے ٹھیٹھ دینی علوم کی طرف رکھی ہے کیونکہ یہی علوم مقصود بالذات ہیں اور انہی سے دنیا و آخرت سے متعلق حقیقی عملی رہنمائی حاصل ہوتی ہے، معقولات کا چونکہ یہ

مقام نہیں ہے' اس لئے اس کو خصوصی توجہ کا مرکز نہیں بنایا' اس طرز عمل کی بنا پر ہندوستان کے بعض علمی حلقے جو معقولات ہی کی مہارت میں مشہور تھے' مثلاً رامپور وغیرہ' ان میں یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ شاید علماء دیوبند معقولات میں دسترس نہیں رکھتے' حالانکہ واقعہ اس کے بالکل برخلاف تھا' درحقیقت اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو عقلی علوم میں بھی ملکہ راسخہ عطا فرمایا تھا اور جب اس کے اظہار کا موقع آتا تو لوگ حیران رہ جاتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ حضرت والد صاحبؒ سے بارہا سنا' فرماتے تھے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب قدس سرہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے اور جامع ترمذیؒ کا درس آپ کے سپرد تھا۔ دوسری طرف حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزارویؒ معقولات کے استاذ تھے اور صدرا' شمس بازغہ جیسے فلسفے کے اسباق وہ پڑھایا کرتے تھے' ایک مرتبہ تقسیم اسباق کے وقت حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ نے فرمایا کہ میں سالہاسال سے منطق فلسفہ پڑھا رہا ہوں' اور کبھی خیال ہوتا ہے کہ اس گندگی کو پڑھانے کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں' اب اس سال میں معقولات کے بجائے حدیث کا کوئی سبق پڑھاؤں گا' حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ نے یہ سنا تو فرمایا : "ٹھیک ہے' پھر آپ حدیث پڑھائیں' میں اس سال فلسفہ پڑھاؤں گا۔" چنانچہ اس تجویز کے مطابق جامع ترمذیؒ حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ کے سپرد ہوگئی اور صدرا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس آگیا۔

اب ہوا یہ کہ حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ نے ترمذی کا درس شروع کیا تو اس شان سے کہ اس میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک راوی کی تحقیق میں کئی کئی دن لگا دیئے اور درس کی رفتار بہت سست ہوگئی' اور دوسری طرف حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ نے صدرا کا درس شروع کیا تو اس طرح کہ طالب علم جب کتاب کی عبارت پڑھ کر فارغ ہوتا تو مولاناؒ ضبط پر قادر نہ ہوتے اور قبل اس کے کہ طلباء اس کا مطلب سمجھ سکیں' حضرت نانوتویؒ فرماتے کہ : "جو کچھ لکھا ہے سب بکواس ہے۔" اور اس کے بعد فلاسفہ کے ان نظریات کی تردید کرتے ہوئے عقلی دلائل کے انبار لگا دیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولاناؒ کا درس طلبہ کی دسترس سے کہیں باہر ہوگیا اور آخر کار منتظمین بھی اس فیصلے پر مجبور ہوئے کہ "ہر کسے را بہر ساختند" پر عمل کرنے کے سوا چارہ کار نہیں۔

فلسفہ اور عقلیات کی حقیقت اور اس کے "پائے چوبیں" کی ناپائیداری حضرت والد صاحبؒ پر روز روشن کی طرح واضح تھی، لیکن جب کبھی آپ کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی کہ معقولات کو درس نظامی سے نکال دیا جائے تو حضرت والد صاحبؒ اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور عقائد پر لکھی ہوئی متقدمین کی کتابیں معقولات کی اصطلاحوں سے بھری ہوئی ہیں، اور اگر قدیم منطق وفلسفہ کو بالکل دیس نکالا دے دیا جائے تو اسلاف کی کتابوں سے خاطر خواہ استفادے کی راہ مسدود ہوجاتی ہے جو ہمارا گرانقدر علمی سرمایہ ہیں۔ اس کے علاوہ منطق وفلسفہ کی تعلیم سے ذہن وفکر کو جِلا ملتی ہے اور ذہن مسائل کو مرتب طریقے سے سوچنے کا عادی بن جاتا ہے، اور اس طرح یہ علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے مسائل کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان علوم کی اصل حقیقت کو ذہن نشین کرکے کوئی شخص اس نیت سے ان علوم کو پڑھے پڑھائے کہ ان سے دینی علوم کی تحصیل میں مدد ملے گی تو ان علوم کی تحصیل بھی عبادت بن جائے گی اور درس نظامی کے مرتبین نے اسی وجہ سے ان کو داخل درس کیا تھا، اور حضرت شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر نیت بخیر ہو تو ہمارے نزدیک بخاری پڑھانے والے اور قطبی پڑھانے والے میں کوئی فرق نہیں، دونوں اپنی اپنی جگہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور دونوں کی خدمت موجب اجر وثواب ہے۔

یوں تو معقولات کے بارے میں حضرت والد صاحبؒ سے بہت سی باتیں سنی ہوں گی لیکن ان میں سے چند جو اس وقت یاد آگئیں، پیش خدمت میں ہیں :

(۱) فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ (حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ) فرمایا کرتے تھے کہ ملاحسنؒ کو منطق میں "ید طولیٰ" حاصل تھا، لیکن بعض اوقات دور کی باتوں تک تو ان کی رسائی ہوجاتی تھی لیکن قریب کی باتیں گرفت میں نہیں آتی تھیں۔

(۲) فرمایا کہ وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر جب انسان نری عقل کی بنیاد پر ہر مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو بسا اوقات حیرانی وسرگردانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، اور بعض بالکل بدیہی باتیں بھی نظری بن جاتی ہیں، مثلاً یہ سوال کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا؟ اگر اس کو خالص عقل اور فلسفے کی بنیاد پر حل کرنا چاہیں تو اس کا شافی جواب ملنا ناممکن ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت اور صفت تخلیق پر ایمان رکھتا ہو، اس کے لئے یہ بالکل

بدیہی مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی قدرت سے انڈے کے واسطے کے بغیر مرغی پیدا فرمادی۔ اس کے بعد انڈا پیدا ہوا۔

(۴) فرمایا کہ فلاسفہ نے بہت سی چیزوں کو جو لازم ذات یا لازم ماہیت قرار دیا ہے۔ یہ واقعے کے بالکل خلاف ہے' حقیقت میں مخلوقات کی کوئی صفت نہ لازم ذات ہوتی ہے نہ لازم ماہیت' اور جس چیز کو فلاسفہ لازم ذات یا لازم ماہیت قرار دیتے ہیں وہ درحقیقت اس ذات یا ماہیت کی وہ صفات عارضہ ہوتی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اس ذات یا اس ماہیت کے ساتھ اکثر پیدا فرمادیتے ہیں' ان کے وجود و عدم میں نہ اس ذات یا ماہیت کا کوئی دخل ہوتا ہے اور نہ وہ اس کے لئے ایسی لازم ہوتی ہیں کہ ان کا انفکاک اس ذات یا ماہیت سے ممکن نہ ہو' چنانچہ یہ کہنا تو درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آگ میں احراق کی خاصیت پیدا فرمادی ہے لیکن احراق کو آگ کا لازم ماہیت قرار دینا درست نہیں' چنانچہ اگر کسی آگ میں اللہ تعالیٰ احراق کی تخلیق نہ فرمائیں تو آگ کا بغیر احراق کے پایا جانا ممکن ہے' جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں ہوا۔ اگر یہ بات ذہن میں رہے تو معجزات میں جو عقلی استبعاد نظر آتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے دور ہوجائے۔

یہ بات احقر نے حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے مختلف عنوانات اور مختلف اسالیب کے ساتھ اتنی مرتبہ سنی کہ دل پر نقش ہوگئی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ میں عہد حاضر کے معروف مفکر سر جیمس جینز کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا' اس میں اس نے اس نظریئے کو بڑے شرح و بسط کے ساتھ ثابت کیا ہے اور لکھا ہے کہ آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافت کے بعد سے کائنات کی میکانکی تعبیر اور نیچر کے نظریات قطعی طور پر غلط ثابت ہوگئے ہیں' اور جدید تحقیقات کی رو سے اشیاء کی کسی ایسی خاصیت کا کوئی وجود نہیں ہے جسے اس کا لازم ذات یا لازم ماہیت کہا جاسکے۔

فقہ

علوم متداولہ میں جس علم سے حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو سب سے زیادہ شغف رہا اور جس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے دین کی عظیم خدمت لی' وہ علم فقہ ہے۔ چنانچہ آپ کی یہی حیثیت دنیا میں زیادہ معروف بھی ہوئی' اور اسی بنا پر آپ کا لقب "مفتئ اعظم"

زباں زد عام ہو گیا۔ میں نے کئی بار تحقیق کرنی چاہی کہ سب سے پہلے کن صاحب نے حضرت والد صاحبؒ کے لئے "مفتیٔ اعظم" کا لقب استعمال کیا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا، البتہ اتنا یاد ہے کہ جب سے میں اردو تحریر پڑھنے کے قابل ہوا اس وقت سے حضرت والد صاحبؒ کے نام آنے والے خطوط میں والد صاحبؒ کے اسم گرامی کے ساتھ "مفتیٔ اعظم پاکستان" الفاظ دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی لقب یا خطاب کے منجانب اللہ ہونے کی علامت غالباً یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی زبان پر اس طرح چڑھ جاتا ہے کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کی ابتدائی تجویز کس نے کی؟ حضرت والد صاحبؒ کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنے بے تکلف لوگوں کو یہ الفاظ لکھنے سے بعض اوقات منع کیا، لیکن اس کے باوجود یہ لقب پھیلتا ہی چلا گیا۔

یوں تو دارالعلوم دیوبند میں حضرت والد صاحبؒ نے فقہ کی متعدد کتابیں بار بار پڑھائیں لیکن فقہ کے ساتھ خصوصی مناسبت اور اس سے غیر معمولی شغف اس وقت پیدا ہوا جب فتویٰ کی خدمت آپ کے سپرد ہوئی۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ فتویٰ کے کام کا ابتداءً مجھ پر بہت بوجھ تھا، اور ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے، اس لئے شروع شروع میں جب مجھے کسی سوال کا جواب لکھنا ہوتا تو خواہ سوال کتنا واضح کیوں نہ ہو جب تک میں اسے کئی کئی کتابوں میں دیکھ کر اطمینان نہ کر لیتا، اس وقت تک چین نہ آتا۔ میں محض یادداشت کے بھروسے پر یا صرف اصول و قواعد کی روشنی میں جواب لکھنے سے حتی الوسع گریز کرتا تھا اور جب تک کسی فقہ کی کتاب میں کوئی صریح جزئیہ نہ مل جائے، جواب نہ لکھتا تھا اس وجہ سے بعض اوقات ایک ایک مسئلے کے جواب کے لئے مجھے دس دس کتابوں کے متعلقہ حصوں کو بہ نظر غائر دیکھنے کی نوبت آجاتی تھی اور اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ایک مسئلے کی تلاش میں دسیوں دوسرے مسائل نظر سے گزر جاتے تھے۔

یہ تو عام قسم کے فتاویٰ کا حال تھا اور جن فتاویٰ میں کوئی خاص تحقیق پیش نظر ہوتی ان میں تو متعلقہ موضوع سے متعلق جتنی کتابیں میسر ہوتیں، والد صاحبؒ ان سب کی مراجعت فرماتے، اور بہت سی وہ کتابیں بھی دیکھتے جو اگرچہ متعلقہ موضوع پر نہ ہوتیں، لیکن ان میں زیر بحث مسئلے کے کسی پہلو کے ملنے کا امکان ہوتا۔ اس طرح ایک ایک مسئلے کی تحقیق پر بڑے مفصل رسالے تیار ہو گئے جن میں سے ایک بڑا حصہ تو شائع ہو چکا ہے اور باقی

دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔

مجھ جیسے بے علم شخص کے لئے حضرت والد صاحبؒ کے فقہی کارناموں اور فتویٰ کی خصوصیات پر لب کشائی کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق معلوم ہوتا ہے، اور البلاغ کے اسی نمبر میں دوسرے ایسے اہل علم نے اس موضوع پر مضامین لکھے ہیں جو اس کے واقعی اہل ہیں۔ لیکن طالب علمانہ حیثیت سے جو چند باتیں اپنی بساط کے مطابق میں سمجھ سکا ہوں انہیں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں :

(۱) حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے افتاء کا منصب ایک ایسے زمانے میں سنبھالا جو فتویٰ کی ذمہ داری محسوس کرنے والے کسی بھی شخص کے لئے انتہائی نازک، مشکل اور محنت طلب دور تھا۔ یہ ٹھیک وہ زمانہ ہے جب کہ مغرب کے سیاسی اور فکری غلبے کے زیر اثر دنیا بھر کے انداز زندگی میں انقلابی تبدیلیاں آرہی تھیں، نت نئی ایجادات کا ایک سیلاب پھوٹ رہا تھا۔ تجارت و معیشت میں نئے نئے معاملات وجود میں آرہے تھے۔ طرز معاشرت اور رہن سہن کے طریقوں میں انقلاب آرہا تھا، اور ان تمام تبدیلیوں کے نتیجے میں ہر صبح ایک ایسا نیا فقہی مسئلہ لے کر نمودار ہوتی تھی جس کا صریح جواب فقہ کی قدیم کتابوں میں ملنا مشکل تھا، اور فتویٰ کے کام کے لئے والد صاحبؒ کو دارالعلوم دیوبند کی اس مرکزی مسند کی ذمہ داری سپرد ہوئی تھی جو نہ صرف ہندوستان، بلکہ پوری دنیائے اسلام میں فتویٰ کا سب سے بڑا مرجع سمجھی جاتی تھی، اس لئے فقہی اعتبار سے اٹھنے والا کوئی سوال اور اہل علم ودانش کے درمیان پیش آنے والا کوئی مباحثہ ایسا نہیں تھا جو قول فیصل یا محاکمے کے لئے وہاں نہ بھیجا جاتا ہو۔

پھر آج تو ہر مفتی کے سامنے رہنمائی کے لئے ماضی قریب کے اکابر کے لکھے ہوئے ضخیم فتاویٰ موجود ہیں، لیکن جس زمانے میں حضرت والد صاحبؒ کو یہ خدمت سونپی گئی ہے اس وقت ان فتاویٰ کے مجموعوں میں سے کوئی موجود نہ تھا، اس لئے جو کچھ لکھنا تھا، براہ راست اصلی ماخذ سے مستنبط کرکے لکھنا تھا اور خود اپنی ذمہ داری پر لکھنا تھا۔ غرض ایک طرف نت نئے مسائل کا انبار تھا، اور دوسری طرف ایسے ماخذ مفقود تھے جن سے عہد حاضر کے مسائل کا کوئی صریح جواب مل سکتا ہو۔

اس پر مستزاد یہ کہ اگر حکومت اسلامی ہو، مسلمان غیر ملکی تسلط سے آزاد ہوں، اور

اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب اپنے فطری ارتقاء کی منازل طے کر رہی ہو' تو نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل آسان ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک عادل اسلامی حکومت کو شریعت نے مباحات کے دائرے میں بڑے وسیع اختیارات دیئے ہیں' اور حکومت ان اختیارات کو کام میں لاکر بہت سے مسائل حل کر سکتی ہے' اس کے علاوہ اگر اسلامی علوم کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو تو ایک محقق کو حکومت کی طرف سے بہت سے وسائل فراوانی کے ساتھ میسر آجاتے ہیں۔ لیکن جس دور میں حضرت والد صاحبؒ نے فتویٰ کی ذمہ داری سنبھالی ہے وہ انگریزی استعمار کا تاریک دور تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے وجود وبقا کے بارے میں حکومت کی نیت خراب تھی' اور ایک مفتی کو قدم قدم پر اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ اس کا کوئی فتویٰ غلط استعمال نہ ہو سکے۔ ادھر یہ ایک فطری بات تھی کہ ایک ایسی مغربی طاقت کے زیر نگیں رہتے ہوئے جو اپنا ایک مخصوص فکری نظام رکھتی تھی' اگر اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جاتا تو یقیناً مسلمانوں کے اجتہادات اپنی حقیقی ضروریات کو پورا کرنے کے بجائے اس مغربی طاقت کو مرعوبیت اور اس کی تقلید کے آئینہ دار ہوتے' جس سے اسلام کی شکل وصورت ہی مسخ ہو جاتی۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس دور میں تجدد اور اجتہاد کا پرچم اٹھایا ان کے "اجتہادات" میں یہ فکری مرعوبیت ناقابل انکار طریقے پر نمایاں ہے اور شاید اقبال مرحوم نے اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ۔

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

لہٰذا اس وقت فتویٰ کے معاملے میں ذرا سی ڈھیل مسلمانوں کے لئے گوناگوں فتنے کھڑی کر سکتی تھی' اور اسلام کی ٹھیک ٹھیک حفاظت اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ علماء دین کے معاملے میں نہ صرف کامل تصلب' بلکہ تقلید اسلاف میں کسی قدر جمود کا مظاہرہ کریں۔ کیونکہ اسلام کا حلیہ بگاڑنے کے لئے تجدّد کی جو تحریکیں ساری دنیائے اسلام میں سر اٹھا رہی تھیں' ان کو اگر علماء کی طرف سے ذرا چھوٹ ملتی تو آج دین اپنی صحیح شکل وصورت میں محفوظ نہ رہتا۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر علماء نے عین حکمت کے تقاضے سے حتی الامکان تقلید شخصی کی بالکل لفظ بہ لفظ پابندی ہی میں عافیت سمجھی اور حضرات اہل فتویٰ نے وہ اختیارات بھی کم سے

کم استعمال کئے جو اجتہاد فی المسائل کے دائرے میں ایک متبحر مفتی کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

ایسے اوقات میں ایک مفتی کا فریضہ انتہائی نازک ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اسے مسلمانوں کی اجتماعی مصلحتوں کا بھی خیال ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی مد نظر رکھنی پڑتی ہے کہ مسلمانوں پر کوئی ناقابل برداشت تنگی پیش نہ آئے اور تیسری طرف اس کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ اس آزاد طرز فکر کو سہارا نہ ملے جو اجتہاد کے نام پر دین کی ایک ایک چول ہلانے کی فکر میں ہے۔ ایسے دور میں خدا کا خوف رکھنے والے مفتی کو ان تینوں باتوں کی رعایت کے ساتھ ایک انتہائی باریک پل صراط پر چل کر نئے مسائل کا جواب دینا پڑتا ہے اور احقر کی ناقص سمجھ میں حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے یہ نازک فریضہ اللہ کی توفیق سے جس حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا ہے وہ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

فقہی تصانیف

(۲) یوں تو حضرت والد صاحبؒ کے لکھے ہوئے فتاویٰ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ جن میں ہر طرح کے سوالات کے جواب موجود ہیں' لیکن خاص طور سے عہد حاضر کے نئے فقہی مسائل پر آپ نے جو مفصل فتاویٰ یا رسائل تحریر فرمائے ان کی فہرست سے اندازہ ہو گا کہ اس پہلو سے حضرت والد صاحبؒ کا کام کتنا وسیع' ہمہ گیر' ٹھوس اور مثبت ہے' ایمان اور طہارت سے لے کر میراث تک تقریباً ہر باب میں نئے مسائل پر آپ کے مفصل رسائل یا فتاویٰ موجود ہیں۔ احقر کے شمار کے مطابق ان کی تعداد اکیانوے ہے اور ان کی فہرست حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی اور حضرت مولانا محمد اشرف صاحب کے مضامین میں آگئی ہے۔

یہ وہ فقہی رسائل ہیں جو فتاویٰ دارالعلوم' جواہر الفقہ' آلات جدیدہ یا احکام القرآن میں یا علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور جو بہت سے رسائل دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کے رجسٹروں میں رہ گئے اور نقل یا شائع نہ ہو سکے' وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں سے بعض رسائل صرف چند صفحوں کے بھی ہیں اور بعض سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس اجمالی فہرست ہی پر اگر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

حضرت والد صاحبؒ قدس سرہ سے خاص طور پر فقہ و فتویٰ کے باب میں اس دور کا کتنا عظیم الشان کام لیا ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے بعد اتنی متنوع اور کثیر فقہی تصانیف میں کوئی ان کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ ان رسائل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عوام سے زیادہ اہل علم کی رہنمائی کرتی ہیں' اور ان کا فائدہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جس موضوع پر وہ لکھے ہیں اس میں شریعت کا حکم اپنے دلائل کے ساتھ واضح ہو جائے' بلکہ ان کے مطالعے سے نت نئے مسائل کا جواب تلاش کرنے کے لئے مستقل اصول استدلال و استنباط معلوم ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اس دور کے مفتی کے لئے بہترین راہ عمل سامنے آجاتی ہے۔

(۳) یوں تو آپ کے فتاویٰ کے مجموعے' فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ہیں' اور خاص طور پر مذکورہ بالا فقہی رسائل میں سے ہر ایک میں' اہل علم کے لئے ساری باتیں کار آمد ہی ہیں' لیکن آپ کی بعض تصانیف ایسی ہیں جن سے جب کبھی استفادے کی نوبت آتی ہے تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے کوئی اسلوب کافی معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسائل کی تحقیق حضرت والد صاحب قدس سرہ کے ذریعے قلمبند اور شائع کرادی' ورنہ اگر آپ وہ کام کرکے نہ جاتے تو بظاہر آج کسی کے بس میں نہ تھا کہ ان مسائل پر تحقیق کا وہ حق ادا کرتا' اور اس اطمینان بخش طریقے پر ان مسائل کا حل تلاش کرتا۔ اور جب میں یہ تصور کرتا ہوں کہ ان مسائل کی تحقیق میں حضرت والد صاحبؒ نے کتنی اولوالعزمی اور استقامت کے ساتھ کتنی محنت شاقہ برداشت کی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہاں میں دو مثالیں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں :

یہ سوال عرصے سے اہل علم کے درمیان زیر بحث تھا کہ برصغیر کی اراضی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یعنی ان پر جو مالکان صدیوں سے متصرف چلے آرہے ہیں۔ ان کا قبضہ شرعاً مالکانہ ہے یا نہیں؟ کیونکہ بہت سی زمینوں میں ایسا ہوا ہے کہ وہ حکومت کی ملکیت تھیں' اور جاگیرداروں کو حکومت کی طرف سے صرف لگان وصول کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ لیکن طوائف الملوکی کے زمانے میں یہ زمیندار خود مالک بن بیٹھے اور ان جاگیرداروں پر مالکانہ تصرف شروع کردیا' شرعاً زمینیں اس طرح ان کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتیں' لیکن یہ معاملہ تمام زمینوں کا نہیں تھا' بلکہ بہت سے زمیندار واقعتہً مالک بھی تھے' اس لئے مسئلہ یہ

تھا کہ ان زمینداروں کو مالک سمجھا جائے یا نہیں؟ اس کے علاوہ اگر زمینیں واقعۃً کسی کی ملکیت میں ہوں تو یہ سوال تھا کہ وہ زمینیں عشری ہیں یا خراجی؟ ان تمام مسائل کی تحقیق اس بات پر موقوف تھی کہ ہندوستان کے مختلف خطے جس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوئے' اس وقت مسلمان حکام نے ان کی زمینوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اور بعد میں ان کے ساتھ معاملے میں کوئی تبدیلی ہوئی یا نہیں؟ یہ تحقیق اس لئے انتہائی پیچیدہ اور دشوار تھی کہ محمد بن قاسمؒ کے وقت سے لے کر عہد حاضر تک برصغیر پر سینکڑوں انقلابات آئے ہیں' اور یہ سارا خطہ کسی ایک وقت میں کسی ایک فاتح کے ہاتھوں فتح نہیں ہوا۔ بلکہ کوئی حصہ کسی نے فتح کیا ہے اور کوئی کسی نے' اب ان تمام خطوں کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ ابتداً وہ کب فتح ہوئے تھے؟ اور ان کے فاتحین نے زمینوں کے مالکان سے کیا معاملہ کیا تھا؟ وہ اپنی ملکیت پر برقرار رکھے گئے تھے؟ یا ان کی اراضی بیت المال میں داخل کرلی گئی تھیں؟ انہیں مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا یا نہیں؟ ایک ایسی مشکل تحقیق ہے کہ اسکے تصور ہی سے پتہ پانی ہوتا ہے۔

لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ نے اپنی کتاب "اسلام کا نظام اراضی" میں ان سنگلاخ مباحث کو نہ صرف چھیڑا ہے۔ بلکہ ان کی تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔ اس غرض کے لئے آپ نے ہندوستان کی فتوحات کی تاریخ کا باستیعاب مطالعہ کیا' اور اس مطالعے کے نتائج کو "فتوح الہند" نامی کتاب میں سمیٹ کر اسے "اسلام کا نظام اراضی" کا جزء بنا دیا۔ اس کے بعد مختلف نادر و نایاب دستاویزات کے ذریعہ اس بات کی تحقیق فرمائی کہ کونسے فاتح نے اراضی کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اور اگر کسی کو جاگیر دی تو وہ کس قسم کی دی؟ پھر اراضی کی ملکیت اور ان کے عشری یا خراجی ہونے کی تحقیق کے لئے فقہ اور حدیث کی تمام متعلقہ کتب کو کھنگالا' اور انتہائی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی سے ان فقہی اصولوں کو ہندوستان کے حالات پر منطبق کیا۔ یہ تمام محنت آپ قیام پاکستان سے پہلے اٹھا چکے تھے' لیکن ابھی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی کہ ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی' اور دو مستقل ملکوں کے قیام اور تبادلۂ آبادی نے اراضی کی صورتحال میں انقلاب پیدا کردیا۔ متروکہ اراضی پر نئے مالکوں کے قبضے اور دونوں ملکوں کے درمیان جائیدادوں کے سلسلے میں نئے معاہدے عمل میں آئے' اور ان معاہدوں کی روشنی میں ان اراضی کی شرعی حیثیت کا از سر نو جائزہ لینا ضروری

ہوگیا' چنانچہ آپ نے قیام پاکستان کے بعد اس کتاب میں مزید دو ابواب کا اضافہ فرما کر ان دقیق اور پیچیدہ مسائل کو ازسرنو حل فرمایا' اور ان سنگلاخ مسائل کو پوری طرح منقح فرما کر اس طرح اس کتاب میں جمع کردیا کہ آنے والے مفتیوں کو ان مسائل میں تحقیق وکاوش کی ضرورت نہیں رہی' لیکن آنے والوں کے واسطے علم و تحقیق کا یہ مغز نکال کر رکھنے کے لئے حضرت والد صاحب قدس سرہ نے کس قدر محنت برداشت کی' کتنی راتوں کو جاگے' کتنی کتابوں کی ورق گردانی کی' اور کن کن مراحل سے گزرے' اس کا اندازہ ہر ایک کو نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح "اوزان شرعیہ" کہنے کو تو چھوٹا سا رسالہ ہے جو کل ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے' لیکن ان بتیس صفحات نے عہد حاضر کے اہل علم' اور خاص طور پر اہل فتویٰ کے لئے جو سہولت میسر کردی ہے وہ بسا اوقات ضخیم تصانیف سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس رسالے کا موضوع یہ ہے کہ شریعت میں بہت سے احکام کا مدار خاص اوزان اور پیمانوں پر ہے' لیکن عہد صحابہؓ میں اور اس کے بعد فقہاء کے زمانے میں جو اوزان اور پیمانے صاع' مد' اوقیہ' رطل وغیرہ کے نام سے رائج تھے' وہ آج کے پیمانوں سے یکسر مختلف تھے۔ ان پیمانوں کا موجودہ دور کے اوزان سے مقابلہ کرکے یہ بتانا ضروری تھا کہ صاع کتنے سیر کا ہوتا ہے اور موجودہ دور میں مُد یا اوقیہ یا مثقال کا وزن کیا ہوگا؟ اگرچہ اس سے پہلے بھی ہندوستان کے متعدد فقہاء نے اس بارے میں اپنی اپنی تحقیقات مرتب فرمائی تھیں' لیکن ان تحقیقات میں اختلاف چلا آتا تھا' خاص طور پر فرنگی محل کے علماء کی رائے دوسرے اہل علم سے مختلف تھی' اور اس کی بنیاد حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ قدس سرہ جیسے وسیع النظر عالم کے فتاویٰ پر تھی۔ اب اس اختلاف پر محاکمہ بڑا پیچیدہ اور مشکل کام تھا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے انتہائی محنت اٹھائی' ایک ایک پیمانے کا خود وزن کیا۔ فقہاء نے درہم وغیرہ کا وزن جو کے دانوں سے مقرر کیا ہے' اور اس کی خاص صفات تحریر کی ہیں' ان خاص صفات کے دانوں کو تلاش کرکے ان کا موجودہ اوزان کے ذریعہ وزن کیا۔ اس کے لئے خود جنگل جا جا کر اصلی رتیاں توڑیں' اور ان سے حساب لگایا' یہاں تک کہ اختلاف کا اصل منشا پالیا جو حضرتؒ ہی کے الفاظ میں یہ ہے :

"اب اس پر حیرت ہوئی کہ مولانا عبدالحی صاحب جیسے محقق اور ماہر

عالم کے حساب میں اتنا عظیم الشان فرق کیسے آیا؟ سو غور کرنے سے خیال
آیا کہ شاید موصوف نے صرف چار جو اور ایک رتی کا باہم وزن فرمایا ہے
اور اس میں تفاوت نامعلوم ہونے کی بنا پر محسوس نہ ہوا۔ پھر اسی پر ستر اور
سو جو کا حساب لگا کر درہم و مثقال کے وزن قائم فرمادیئے۔ ستر جو اور سو جو
کو مجموعی طور پر وزن نہیں فرمایا' ورنہ یہ مغالطہ ہرگز نہ رہتا' چنانچہ اس
خیال کے امتحان کے لئے چار جو اور ایک رتی کا وزن کیا تو اس خیال کی
پوری تصدیق ہوگئی.... الخ

(اوزان شرعیہ ص ۸)

غرض اس مختصر رسالے کی تالیف میں آپ نے فقہ' طب اور لغت کی نادر و نایاب کتب سے بھی مدد لی اور ہر ایک وزن اور پیمانے کا بذات خود عملی تجربہ بھی کیا' اور تحقیق و تدقیق کا یہ بار خود برداشت کر کے آنے والوں کے لئے مسئلہ بالکل واضح کر گئے' اب جہاں کوئی پرانا وزن یا پیمانہ نظر پڑے' اس کا محقق ہندوستانی وزن اس رسالے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ عام لوگوں کو تو اس تالیف کی قدر ہو ہی نہیں سکتی' لیکن اہل علم نے اس کی قدر پہچانی ہے۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ نے اس کا مطالعہ کر کے تحریر فرمایا :

"اس قدر تحقیق و کاوش آپ ہی کا حصہ تھا' حق تعالیٰ جزائے خیر دے'
مجھے اس کے مضمون سے اتفاق ہے۔"

"حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیملپوری قدس سرہ' محدث مظاہر العلوم سہارن پور نے لکھا :

"حضرت مؤلف دام مجدہ نے تحقیق و تدقیق محنت و تفتیش کے ساتھ
اس رسالے کی تصنیف سے مسلمانوں کی شدید ضرورت کو پورا کیا۔"

حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمتہ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا :

"بڑی ضروری تحقیق فرمائی' آپ اجازت دیں تو اس کی تلخیص معارف میں شائع کردوں' میں خود اس میں بہت متردد تھا' مگر چونکہ حساب سے مجھے فطرۃ لگاؤ نہیں اس لئے کبھی ادھر کبھی ادھر میلان ہوتا تھا...... اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔" اور حضرت مولانا ظفر احمد

صاحب عثمانی قدس سرہ جیسے بالغ نظر محقق عالم نے لکھا :

"نسررت بها مسرة من رآى هلال العيد ووجدت بها وجد من ادرك الفقيد، فلله دره من محقق تدانى بما لا يحتمل المزيد من تحقيق انيق ومن مصيب قد وفق لاستخراج الدرر من الدرر من لجة بحر عميق"۔

مجھے یہ رسالہ پڑھ کر ایسی مسرت ہوئی جیسے ہلال عید دیکھ کر ہوتی ہے اور ایسا لطف آیا۔ جیسے کوئی گمشدہ دولت مل جانے سے آتا ہے۔ قابل صد تعریف ہے وہ محقق جس نے ایسی نادر تحقیق کی جس پر اضافہ ممکن نہیں' اور جسے گہرے سمندر کی موجوں سے موتی نکال کر لانے کی توفیق عطا ہوئی۔"

اور مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم نے صدق جدید لکھنؤ میں لکھا :

"اور حق یہ ہے کہ سعی وکاوش کا حق ادا کردیا ہے۔ ان کی تحقیق کی تصدیق پر تو حضرت مولانا تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے جید علما کی مہریں ثبت ہیں' باقی جہاں تک تدقیق وموشگافی کا تعلق ہے اس کا اندازہ تو ہم عامیوں کو بھی ہو سکتا ہے اور اس کی داد دل سے بیساختہ نکلتی ہے۔ رشک کے ساتھ حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں بھی ایسے ایسے عنوانات پر اس درجہ تحقیق کرڈالنے والے موجود ہیں۔"

یہ دو مثالیں احقر نے صرف یہ دکھانے کے لئے پیش کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو اس دور کی دینی اور خاص طور پر فقہی ضروریات پوری کرنے کے لئے پیدا فرمایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس منصب کا حق ادا کرنے میں کسی سخت سے سخت محنت سے بھی دریغ نہیں فرمایا' اور بہت سے سنگلاخ مسائل میں خود اپنا لہو پانی کرکے دوسروں کے لئے راہ عمل واضح فرما گئے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ!

(۴) احقر نے حضرت والد صاحب قدس سرہ سے خود سنا ہے کہ فقہ کے جو ابواب مجھے جتنے زیادہ مشکل معلوم ہوئے۔ میں نے ان کی تحصیل میں اتنی ہی زیادہ کاوش کی' چنانچہ فرماتے تھے کہ مجھے شروع میں وقف کے مسائل سے زیادہ مناسبت نہیں تھی' اور جب کبھی وقف کا کوئی سوال آتا تو مجھے اس سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اس کا علاج میں نے اس طرح کیا کہ

وقف کے بارے میں جتنی کتابیں مجھے میسر آئیں ان کا باستیعاب مطالعہ کرلیا' فقہ کی متداول کتب کے علاوہ امام خصافؒ کی کتاب الوقف اور الاسعاف فی حکم الاوقاف کا بھی مطالعہ کیا' یہاں تک کہ میری عدم مناسبت انشراح میں تبدیل ہو گئی' اور اللہ تعالیٰ نے جن ابواب سے مجھے خصوصی مناسبت عطا فرمائی ان میں وقف بھی شامل ہے۔ اسی ذیل میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حنفیہ کی کتابوں میں سے جس کتاب نے وقف کے مسائل کو سب سے زیادہ شرح و بسط اور انضباط کے ساتھ بیان کیا ہے وہ "فتاویٰ مہدویہ" ہے۔

آج کل سہولت پسندی کی وجہ سے حال عام طور سے یہ ہو گیا ہے کہ فتویٰ نویسی کے لئے عموماً انہی مسائل کی تحقیق کی جاتی ہے جن کا سوال باقاعدہ آتا ہے' لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق وکاوش صرف انہی مسائل کی حد تک محدود نہ تھی جو آپ سے باقاعدہ پوچھے جاتے' اس کے بجائے آپ کے ذہن میں ہر وقت تحقیق طلب مسائل کی ایک فہرست رہتی تھی اور جب کبھی موقع ملتا آپ ان میں سے کسی کی تحقیق کر لیتے تھے' خواہ اس کے لئے آپ سے سوال نہ پوچھا گیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کا مطالعہ صرف شامی' عالمگیری یا اسی طرح کی معروف و متداول کتب تک محدود نہیں تھا' بلکہ آپ نے وہ کتابیں باقاعدہ پڑھی تھیں جنہیں آج کل کے اہل علم کو چھونے کی بھی نوبت نہیں آتی۔ مثلاً امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی "شرح السیّر الکبیر" وہ کتاب ہے جو باقاعدہ فقہی ابواب پر مرتب نہیں ہے۔ اس کا اصل موضوع جنگ و صلح' جہاد غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات وغیرہ ہے' لیکن ضمناً اس میں بہت سے اہم مسائل دوسرے ابواب سے متعلق بھی آگئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والد صاحبؒ نے اس کا مکمل طور پر یا اس کے بہت بڑے حصہ کا مطالعہ فرمایا تھا' چنانچہ بہت سے بظاہر غیر متعلق مسائل اس کے حوالے سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ "شرح السیّر الکبیر" کے اس نسخے پر جو آپ کے مطالعے میں تھا' جابجا آپ کے قلم سے نوٹ لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

فقہ وفتویٰ کی عام کتابوں کے علاوہ آپ کو ان کتب اور رسائل سے بھی شغف تھا جو کسی خاص مسئلے کی تحقیق کے لئے لکھے گئے ہوں' چنانچہ آپ علامہ ابن نجیمؒ کے رسائل زینیہ' علامہ شامیؒ کے رسائل ابن عابدین' حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ' حضرت علامہ ظہیر احسن نیمویؒ اور دوسرے علما کے مجموعہ ہائے رسائل بڑی احتیاط کے ساتھ رکھتے

اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے' چنانچہ آپ کی فقہ کی الماری میں کئی خانے اسی قسم کے رسائل سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور ان پر آپ کے قلم کی لکھی ہوئی یادداشتوں اور نشانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض الماری کی زینت ہی نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کے مطالعے میں رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران بارہا ایسا ہوتا کہ کسی موضوع پر بات چھڑتی تو آپ فرماتے کہ فلاں عالم نے اس موضوع پر مستقل رسالہ لکھا ہے۔

اس قسم کے رسائل عام طور سے کبھی کبھار چھپتے ہیں' اور ایڈیشن ختم ہونے پر نایاب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو جہاں کہیں اس طرح کا کوئی رسالہ ملتا' آپ اسے غنیمت سمجھ کر خرید رکھتے تھے' اور اگر خریدنا ممکن نہ ہوتا تو اسے نقل کرانے کا اہتمام کرتے تھے' چنانچہ آپ کے پاس متعدد رسائل ایسے ہیں جنہیں خود آپ نے مصروفیات کے غیر معمولی ہجوم کے باوجود خود اپنے قلم سے نقل فرمایا ہے۔ مثلاً ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ میں آپ کا لاہور جانا ہوا' وہاں حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس علامہ قاسم حنفی رحمتہ اللہ علیہ کا رسالہ "ردالقول الخائب فی القضاء علی الغائب" آپ کی نظر سے گزرا۔ جو اس مسئلے پر لکھا گیا ہے کہ اگر مدعا علیہ غائب ہو تو قاضی کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ یہ رسالہ بمبئی میں چھپا تھا' اور اب اس کے ملنے کا کوئی امکان نہ تھا' چنانچہ آپ نے اس سفر میں یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل فرما لیا جو آپ کی کتابوں میں محفوظ ہے' یہ بڑے پاکیزہ اور خوشنما عربی خط میں لکھا ہوا ہے' اور حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ۱۳۷۲ھ آپ کی مصروفیات کے شباب کا زمانہ ہے جس میں آپ ملک کی دینی' سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے رہے تھے' اور غالباً ایسے ہی کسی کام کے لئے لاہور تشریف لے گئے ہوں گے' ایسی مصروفیات کے عین درمیان ایک ایسے رسالے کو نقل کرنا جو ایک جزوی مسئلے کی تحقیق میں ہے اور جس کی کوئی فوری ضرورت بھی نہیں ہے' ایک ایسا اقدام ہے جو صرف طلب علم کا جذبۂ بیتاب ہی کرا سکتا ہے۔

اسی طرح محرم ۱۳۸۲ھ میں آپ عمرہ کی غرض سے حجاز تشریف لے گئے' وہاں مدینہ منورہ میں کسی عالم کے پاس حضرت علامہ محمد عابد سندھی ؒ کا ایک قلمی رسالہ "الکرامتہ والتقبیل" آپ کی نظر سے گزرا جس میں دو مسئلوں کی تحقیق تھی' ایک یہ کہ اولیاء کرام ؒ کی کرامات کی شرعی حیثیت کیا ہے" اور دوسرے یہ کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پاؤں چومنے کا شرعاً

کیا حکم ہے؟ علامہ سندھیؒ کا یہ رسالہ علامہ موسیٰ جار اللہ کے قلم سے لکھا ہوا تھا' چونکہ کہیں اور اس رسالے کے ملنے کا امکان نہ تھا' اس لئے آپ نے وہیں پر خود اسے نقل کرنا شروع فرمادیا' یہاں تک کہ جب اس کے چودہ صفحات نقل فرما چکے تو مدینہ طیبہ کے معروف ترکی عالم شیخ محمود الطرازی مدظلہم نے دیکھ لیا اور پیشکش کی کہ میں کسی اور سے آپ کے لئے نقل کرادوں گا' چنانچہ باقی رسالہ انہوں نے نقل کرواکے دیا اور حضرت والد صاحبؒ نے اسے مجلد کراکر محفوظ فرمادیا۔

علامہ جمال الدین قاسمی رحمتہ اللہ علیہ (صاحب تفسیر القاسمی) کا ایک رسالہ "الفتویٰ فی الاسلام" آپ کی نظر سے گزرا جو فتویٰ کے اصول اور تاریخ پر بہترین رسالہ ہے' اس وقت خود نقل کرنا ممکن نہ تھا' چنانچہ آپ نے اسے مولانا مظہربقا صاحب سے نقل کرایا۔

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب "حیات القلوب" فارسی زبان میں حج کے مسائل پر بے نظیر کتاب ہے۔ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں والد صاحبؒ کی نظر سے گزری تھی' لیکن نایاب ہوچکی تھی۔ اس کا ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں امام المناسک حضرت مولانا شیر محمد صاحب سندھیؒ کے پاس تھا جو مدینہ طیبہ میں مقیم تھے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ اس کتاب کو نقل کرنا چاہتے تھے' کتاب خاصی ضخیم تھی' اور فوٹو اسٹیٹ کی موجودہ سہولیات میسر نہ تھیں۔ آپ نے حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ ہی سے فرمائش کی کہ نقل کا کوئی انتظام فرمادیں۔ حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے مسائل حج کا امام بنایا تھا' اور انہی مسائل کی نشرواشاعت کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہوا تھا چنانچہ انہوں نے والد صاحبؒ کی فرمائش کو اس شرط پر قبول فرمالیا کہ آپ اس کی اشاعت کا انتظام فرمائیں۔ یہ والد صاحبؒ کی عین مراد تھی' چنانچہ آپ نے وعدہ کرلیا اور حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ نے خود اپنے قلم سے اس کی نقل ایک بڑے رجسٹر میں کرکے حضرت والد صاحبؒ کے پاس بھیج دی۔ آپ مسلسل اس کی طباعت کی فکر میں رہے' یہاں تک کہ ۱۳۹۱ھ میں بڑی محنت شاقہ اٹھا کر اسے خود اپنی نگرانی میں شائع کرایا۔

ان چند مثالوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ فقہ وفتویٰ میں حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا مذاق محض وقتی ضروریات اور متداول کتابوں تک محدود نہ تھا' بلکہ علم کی ایک نہ بجھنے والی پیاس تھی جو آپ کو وقتاً فوقتاً گوناگوں مسائل پر غور اور اس کے لئے نادر ونایاب کتب کی

تلاش اور مطالعے پر مجبور کرتی رہتی تھی' اور آپ اس بارے میں سخت سے سخت محنت اٹھانے سے بھی دریغ نہیں فرماتے تھے۔

(۵) فتویٰ کے کام میں یہ صورتحال اکثر پیش آتی ہے کہ انسان کسی ایک مسئلے کی تلاش میں کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے' اور مطلوب مسئلہ ملنے سے پہلے اس میں بہت سے دوسرے کارآمد مسائل نظر آجاتے ہیں' لیکن چونکہ اس وقت ان کی ضرورت نہیں ہوتی' اس لئے ان کی طرف توجہ نہیں ہوپاتی' اور مطلوبہ مسئلے کی تلاش میں انہیں نظرانداز کرکے گزر جاتا ہے۔ بعد میں جب کبھی ان مسائل کی ضرورت پیش آتی ہے تو یاد آتا ہے کہ یہ مسئلہ کہیں دیکھا تھا' لیکن کیا اور کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اس غرض کے لئے ایک ضخیم بیاض بنائی ہوئی تھی' اور اس کو فقہی ابواب پر مرتب کرکے ہرباب کے عنوان کے تحت کئی کئی صفحات سادے چھوڑ دیئے تھے' اور طریق کار یہ تھا کہ جب کبھی مطالعے کے دوران کوئی اہم مسئلہ یا نئی تحقیق نظر پڑتی تو اس کا خلاصہ یا کم از کم حوالہ اس بیاض میں متعلقہ باب کے تحت نوٹ کرلیتے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں ہمیشہ اس کی پابندی تو نہ کرسکا کہ جب بھی کبھی کوئی اہم مسئلہ یا تحقیق کہیں نظر پڑے تو اس کا حوالہ ضرور اس بیاض میں درج کرلیا کروں' لیکن ایک زمانے تک اکثر وبیشتر اس پر عمل کرتا رہا۔ اس طرح آپ کے پاس نادر یادداشتوں اور حوالوں کا بڑا گرانقدر ذخیرہ جمع ہوگیا تھا' اور ضرورت کے وقت اس میں بہت سی کام کی باتیں یا مفید حوالے مل جاتے تھے۔

جب ہم لوگوں نے فراغت کے بعد حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں فتویٰ نویسی کی تربیت لینی شروع کی تو حضرتؒ نے ہمیں بھی نصیحت فرمائی تھی کہ اپنے پاس ایک ایسی بیاض بناکر رکھیں' چنانچہ ہم نے بھی اس پر عمل کیا' اور باوجود یہ کہ اس میں اندراجات کا التزام نہ ہوسکا' لیکن جتنا کچھ ہوا اس کے فوائد محسوس کئے۔

(۶) حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ فتویٰ کی اہلیت محض فقہی مسائل کو یاد کرنے یا فقہی کتابوں میں استعداد پیدا کرلینے سے حاصل نہیں ہوتی' بلکہ یہ ایک مستقل فن ہے جس کے لئے ماہر مفتی کی صحبت میں رہ کر باقاعدہ تربیت لینے کی ضرورت ہے' اور جب تک کسی نے اس طرح فتویٰ کی تربیت حاصل نہ کی ہو' اس وقت تک وہ خواہ دسیوں بار ہدایہ وغیرہ کا

درس دے چکا ہو' فتویٰ دینے کا اہل نہیں بنتا۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ کسی ماہر مفتی سے تربیت لئے بغیر فتویٰ دینا مستند عالم کے لئے بھی جائز نہیں ہے' چنانچہ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے مستقل مفتی بننے سے پہلے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ سے فتویٰ کی تربیت لی تھی' اور آپ کی وفات کے بعد بھی جب فتویٰ کی تمام تر ذمہ داری حضرت والد صاحبؒ پر آگئی تو ایک مدت تک کوئی فتویٰ صرف اپنے دستخط سے روانہ نہیں کیا' بلکہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ' شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ یا حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ یا شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ میں سے کسی نہ کسی سے تصدیق و توثیق ضرور کراتے تھے۔

چنانچہ اگر کسی شخص کے بارے میں والد صاحبؒ کو اطلاع ملتی کہ اس نے کسی شیخ سے تربیت لئے بغیر خود بخود فتویٰ کا کام شروع کر دیا ہے' تو حضرت والد صاحبؒ کو ان سے فتویٰ کے معاملے میں کبھی مناسبت نہ ہوتی' اور ان کی طرف سے افراط و تفریط کا ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا۔

اس ضمن میں اپنی ایک حماقت یاد آئی۔ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس جہاں روزانہ ڈاک میں دسیوں استفتاء آیا کرتے تھے۔ وہاں صبح و شام ٹیلی فون پر مسائل معلوم کرنے کا سلسلہ بھی رہتا تھا' اور سوال کرنے والے وقت بے وقت فون کرتے رہتے تھے' مجھے یاد ہے کہ جب ہم لوگ مدرسے میں پڑھتے تھے تو اس زمانے میں جب کسی مستفتی کا فون آتا تو حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ بذات خود اس سے بات کرتے تھے' اور اگر کبھی ہم نے فون پر سوال معلوم کر کے حضرتؒ کے سامنے نقل کر دیا تو ہمارے ذریعے جواب دلوانے کے بجائے خود فون لے کر سوال دوبارہ سنتے اور بذات خود جواب دیتے تھے' مبادا کہ ہم سے سوال سمجھنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو یا جواب نقل کرنے میں کوئی بے احتیاطی ہو جائے۔ اس کے بعد جب حضرتؒ کو اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ ہم سوال کو ٹھیک سمجھ کر صحیح صحیح نقل کر دیتے ہیں' اور جواب میں بھی کوئی تصرف نہیں کرتے تو معمول یہ ہو گیا کہ اگر ہم نے ٹیلیفون اٹھایا تو سوال معلوم کر کے حضرتؒ سے ذکر کر دیا۔ آپ نے جواب دیا' اور ہم نے اسے فون پر بتا دیا۔ عرصہ دراز تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا' ایک مرتبہ کسی صاحب کا ٹیلی فون آیا اور انہوں نے کوئی ایسی بات پوچھی جس کا جواب بالکل واضح تھا۔ میں نے سوچا کہ

اس سوال کا جواب بہت آسان ہے اور اس کے لئے حضرت والد صاحبؒ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں، ہو سکتا ہے کہ اس میں اپنی تن آسانی کو بھی دخل ہو، اور شاید نئے نئے فارغ التحصیل ہونے کی بنا پر علمیت کا گھمنڈ بھی اس کا سبب بنا ہو کہ میں نے حضرت والد صاحبؒ سے پوچھنے کے بجائے خود ہی ان کو جواب دے کر فارغ کر دیا، اور جب والد صاحبؒ نے فون کے بارے میں پوچھا تو میں نے سوال وجواب دونوں نقل کر دیئے۔ حضرت والد صاحبؒ نے چند لمحے توقف کے بعد فرمایا : "خیر! جواب تو تم نے ٹھیک دے دیا، لیکن آئندہ ایسا نہ کرنا۔" اس وقت مجھے اپنی حماقت کا شرمندگی کے ساتھ احساس ہوا، اور آئندہ کسی کو از خود جواب دینے سے توبہ کرلی، چنانچہ اس کے بعد کسی نے خواہ کتنی بدیہی بات پوچھی ہو والد صاحبؒ سے پوچھے بغیر اس کو جواب نہ دیتا۔

اس کے کافی عرصے کے بعد وہ وقت بھی آیا کہ ایک مرتبہ میں نے کسی ٹیلی فون کا سوال جا کر نقل کیا تو فرمایا : "اب اس قسم کے سوالات کا جواب خود دے دیا کرو۔" لیکن سابقہ تنبیہہ دل پر کچھ ایسی نقش ہو گئی تھی کہ یہ اجازت ملنے کے بعد بھی اکثر وبیشتر خود جواب دینے کا حوصلہ نہ ہوتا، اور بالکل بدیہی سوالات کا جواب دینے کی جرأت بھی عرصہ دراز کے بعد پیدا ہوئی، اور یہ بات تو آخر وقت تک رہی کہ اگر جواب میں کوئی خفیف سا شبہ بھی ہوتا تو پوچھے بغیر جواب دینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ٹیلی فون اب بھی آتے ہیں، لیکن اب اگر کوئی شبہ ہوتا ہے تو سوائے اس کے کوئی حل نہیں کہ سوال کرنے والے صاحب کو کوئی دوسرا وقت بتایا جائے، یا کتاب دیکھی جائے، یا اپنے کسی استاذ سے رجوع کیا جائے مگر اس تمام کاوش کے بعد بھی اطمینان قلب کی وہ دولت کوئی کہاں سے لائے جو پہلے چند لمحوں میں والد صاحبؒ سے سوال کر کے حاصل ہو جایا کرتی تھی۔

(۷) حضرت والد صاحبؒ کو خود رائی سے نفرت تھی، وہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کی یہ گرانقدر نصیحت بار بار سنایا کرتے تھے کہ "جب تک تمہارے ضابطے کے بڑے موجود ہوں[1] ان سے استصواب کئے بغیر کبھی کوئی اہم کام نہ کرو، اور جب ضابطے کے بڑے

---

[1] اس کے ساتھ ہی حضرت والد صاحبؒ حضرت تھانویؒ کا یہ ارشاد نقل فرماتے تھے کہ میں نے "ضابطے کے بڑے" اس لئے کہا ہے کہ یہ بات تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اس کے نزدیک کون بڑا اور کون چھوٹا ہے؟

نہ رہیں تو اپنے معاصرین اور برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو' اور وہ بھی نہ رہیں تو اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرو۔" چنانچہ ساری عمر والد صاحبؒ کا عمل اسی کے مطابق رہا اور ہم نے تو ان کا وہی زمانہ پایا جس میں ان کے بڑے تقریباً رخصت ہو چکے تھے۔ معاصرین بھی کم تھے اور زیادہ تر چھوٹے ہی تھے' لیکن آپ ہر اہم فیصلے سے پہلے جو چھوٹے بڑے میسر ہوں ان سے مشورہ ضرور فرماتے تھے۔

یہ معمول دوسرے معاملات میں تو تھا ہی' لیکن کسی نئے فقہی مسئلے کی تحقیق کرنی ہو تو اس میں اس بات کا ہمیشہ بہت لحاظ رکھتے تھے' چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم اور جواہرالفقہ میں مختلف فقہی مسائل پر جو مستقل رسالے موجود ہیں' ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ ان کے آخر میں اس زمانے کے معروف اہل فتویٰ اور اہل علم کی تصدیقات ساتھ لگی ہوئی ہیں جس سے واضح ہے کہ آپ نے حتی الامکان کوئی نئی تحقیق دوسرے اہل علم سے مشورے کے بغیر شائع نہیں فرمائی اور آخری سالوں میں تو آپ نے شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ کے ساتھ اس غرض کے لئے کراچی کے اہل علم کی ایک باقاعدہ مجلس قائم فرمادی تھی جس کا نام "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" تھا اور اس کا کام ہی یہ تھا کہ وہ نو پیش آمدہ مسائل کی اجتماعی طور پر تحقیق کرے۔ اس مجلس کا اجلاس عموماً ہر مہینے ایک مرتبہ ہوتا تھا' کبھی دارالعلوم میں اور کبھی جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن میں۔ اس اجلاس میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا مفتی رشید صاحب مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد اور دارالعلوم اور نیوٹاؤن کے خاص خاص اساتذہ شریک ہوتے تھے۔ ہم خدام بھی حاضر رہتے اور ان بزرگوں کی شفقت وعنایت کی انتہا تھی کہ ہمیں بھی کھل کر اپنے اشکالات وشبہات پیش کرنے کا موقع دیتے اور ہر بات پر پوری سنجیدگی اور اہمیت کے ساتھ غور فرماتے تھے۔ اور غالباً یہ حضرت تھانوی قدس سرہ کی مذکورہ بالا وصیت ہی کا اثر تھا کہ جب کوئی تحریر تیار ہوتی تو اس پر ہم جیسے خدّام کے بھی دستخط کرائے جاتے تھے' حضرت والد صاحبؒ کے تحریر فرمودہ فتوے پر ہم جیسوں کا "الجواب صحیح" لکھنا بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ ان کا حکم تھا جس کی تعمیل کی جاتی تھی۔

ظاہر ہے کہ فقہی معاملات میں اس قدر احتیاط جس شخص کا مذاق زندگی بن چکی ہو' وہ خود رائی وخود بینی سے کس درجہ دور ہوگا؟ چنانچہ آپ کو "تفرد" (دوسرے علماء سے ہٹ کر

کوئی ذاتی موقف اختیار کرنے) سے نفرت تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ فقہا کرامؒ نے محقق ابن ہمامؒ اور شاہ ولی اللہ جیسے اصحاب اجتہاد کے تفردات کو قبول نہیں کیا تو بعد کے علماء کا معاملہ تو ان کے مقابلے میں بہت اہون ہے۔ چنانچہ اگر کبھی آپ کا ذہن کسی ایسی رائے کی طرف مائل ہوتا جو معروف نقطہ نظر سے مختلف ہوتی تو آپ اس تلاش میں رہتے کہ یا تو فقہاء متقدمین میں سے کسی کا قول اس کے موافق مل جائے' یا معاصر علماء اس رائے پر مطمئن ہو جائیں اور جب تک یہ نہ ہوتا اس وقت تک آپ عموماً اس رائے کے مطابق فتویٰ نہ دیتے تھے۔

اس احتیاط کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ "الحیلۃ الناجزۃ" وہ کتاب ہے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے مصیبت زدہ عورتوں کی مشکلات کے حل کے لئے مرتب کروائی تھی اور اس میں بہت سے مسائل میں مالکی مذہب کے مطابق مصیبت زدہ عورت کے لیے خلاصی کی راہ نکالی گئی ہے۔ اس کتاب کی تالیف حضرت تھانوی قدس سرہ نے ابتداءً جن دو بزرگوں کے سپرد کی تھی ان میں سے ایک حضرت والد صاحبؒ تھے اور دوسرے حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ لہٰذا حضرت والد صاحبؒ اس کتاب کی تالیف میں شروع سے آخر تک براہ راست شریک رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حجاز کے علمائے مالکیہ سے جو خط وکتابت کی گئی اس سے بھی اور اس کے علاوہ جتنے مراحل تالیف کے دوران پیش آئے' ان سب سے بھی حضرت والد صاحبؒ پوری طرح باخبر رہے' لیکن حضرت تھانوی قدس سرہ اور حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحبؒ کی وفات کے بعد جب حضرت والد صاحبؒ کو اس کتاب کے بعض مقامات میں اجمال محسوس ہوا اور ان کی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی تو باوجودیہ کہ حضرت والد صاحبؒ بذات خود اس وضاحت پر مطمئن تھے اور اس کا پورا پس منظر بھی آپ کے سامنے تھا' اور اس وقت دنیا بھر میں "الحیلۃ الناجزۃ" کے مسائل کے پورے پس منظر سے آپ سے زیادہ کوئی واقف نہ تھا۔ لیکن آپ نے یہ گوارا نہیں فرمایا کہ محض اپنی رائے سے اس وضاحت کے مطابق فتویٰ دے دیں' بلکہ پہلے اس وقت کے اہل فتویٰ حضرات سے استصواب کیا اور اس کے بعد اپنی رائے ظاہر فرمائی۔

حضرتؒ کا فقہی مقام

(۸) مذکورہ بالا گزارشات کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بڑا آدمی یونہی آسانی سے بڑا نہیں بن جاتا۔ بلکہ کسی بھی علم وفن میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرنے اور مقام کو خدمت دین اور خدمت خلق کے نقطہ نظر سے مفید بنانے کے لئے بڑے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علوم دین اور بالخصوص فقہ وفتویٰ میں جو مقام بلند عطا فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی عطاء خاص کے علاوہ ظاہری اسباب میں اس طرز عمل کا نتیجہ ہے جو آپ نے اس سلسلے میں اختیار فرمایا اور اس طرز عمل کا خلاصہ احقر کی ناچیز رائے میں چار چیزیں ہیں۔ پیہم محنت' للّٰہیت' بزرگوں کی صحبت اور ان سے تربیت حاصل کرنے کا اہتمام اور غایت احتیاط ان چار باتوں کے مکمل اہتمام کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو فقہ اور فتویٰ میں وہ مقام بخشا جو ان کے اہل عصر میں سب سے زیادہ منفرد اور ممتاز تھا۔

"فقیہ النفس" فقہا کی ایک اصطلاح ہے' اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ میں کثرت ممارست کے بعد ایک ایسا ذوق سلیم عطا فرمادیا ہو جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا ہو۔

مجھ جیسے بے علم وعمل شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ کسی کے بارے میں فقیہ النفس ہونے کا فیصلہ کرے' کیونکہ فقیہ النفس کی پہچان بھی انہی لوگوں کا حصہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تبحر علمی سے نوازا ہو۔ چنانچہ اس پہچان کے لئے بھی حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جیسے انسان کی ضرورت ہے جنہوں نے علامہ ابن عابدین شامیؒ جیسے وسیع العلم انسان کو بھی "فقیہ النفس" تسلیم کرنے سے انکار کیا' اور فرمایا کہ یہ لفظ علامہ ابن نجیمؒ جیسے حضرات پر راست آتا ہے' اور ساتھ ہی اپنے دور میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے بارے میں اعتراف فرمایا کہ وہ فقیہ النفس تھے۔

لہٰذا میری یہ مجال نہیں ہے کہ میں حضرت والد صاحبؒ کے فقیہ النفس ہونے یا نہ ہونے پر کوئی تبصرہ کرسکوں' البتہ یہاں دو باتیں ضرور عرض کرنا چاہوں گا' ایک تو یہ کہ مصر کے معروف اور محقق عالم شیخ الاسلام علامہ زاہد الکوثری رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحبؒ کو "فقیہ النفس" کا خطاب دیا تھا۔ علامہ زاہد الکوثریؒ وہ بزرگ ہیں جن کو ان کے

تبحر علمی اور وسعت معلومات کی بنا پر اگر مصر کے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایک فقہی مسئلے کی تحقیق میں ان کو خط لکھا تھا، اس خط کا جو جواب آیا اس کا کچھ حصہ والد صاحبؒ نے اپنے رسالے "آلہ مکبر الصوت" میں شامل فرمایا ہے، لیکن غالباً تواضع کی بنا پر پورا خط نقل نہیں فرمایا، بحمد اللہ یہ مکتوب حضرت والد صاحبؒ کے مسودات میں بعینہٖ محفوظ ہے۔ یہاں میں وہ پورا مکتوب نقل کرتا ہوں۔

علامہ زاہد کوثریؒ کا مکتوب

إلی حضرة أخينا فی الله العلامة المحدث الفقيه المفتی محمد شفيع الديوبندی حفظه الله ورعاه وعليكم سلام الله ورحمته وبركاته امابعد فقد تلقيت كتابكم الكريم فی ١٥ صفر ١٣٦٩ھ وتاخر وصوله جدا التأخر بسبب الخطأ فی العنوان. وسررت كل السرور بتفضلكم بإرسال خطابكم فحمدت الله سبحانه علی عافيتكم وتوليكم شئون الدين مع زملائكم الافضل تحت رئاسة شيخ الاسلام وعلم الاعلام مولانا شبير احمد العثمانی اطال الله بقاءه فی خير وعافية ووفقكم جميعا لإنهاض العلوم الاسلامية وترسيخ أسس الشرع الإلٰهی فی تلك الدولة الفتية الاسلامية التی نعقد بها آمالا كبيرة، ورجائی أن تبلغوا اخلص تحياتی وأصدق احترامانی لذلك النحرير الفذ محقق العصر مولانا العلامة العثمانی، شفاه الله الشافی مما ألمّ به شفاء لا يغادر سقما، مع انتظار البيات العلمية فی الاقطار بفارغ الصبر الی بذل بعض همه العلية لاكمال نشرها فی شرحه العظيم من كل ناحية.

ومن مدة بعيدة كنت متشوقا إلی ذاتكم الكريمة، حيث كنت رأيت آثاركم الممتعة وانتفعت بها وكان الاستاذان البنوری والبجنوری يعطران مجالسنا بثنائكم العاطر، ولذا تضاعف سروری بتوليكم عضوية المجلس الذی يرؤسه مولانا الجهبذ الفرد العثمانی، وكما تكم ناشئة عن تواضعكم البالغ والا فمبلغ علو منزلتكم فی العلوم تحت اعتراف الجميع قربا وبعدا، فمنا الدعوات الصادقة لكم جميعا للنجاح الكامل فی مهمتكم

محفوظين من شرور الإسماعيلية والقادنية ومن لف لفهم في الداخل والخارج ۔

وأما الاستفتاء فانت ابن بجدة الفتوى، وقد طالت ممارستكم حتى اصبحت فقيه النفس بالمعنى الصحيح، وملاحظاتكم المرقمة في غاية الوجاهة ... إلا أني لا أتقدم بتوقيع فتوى وأرى ان هذا يكون اجتراء ازاء براعتكم الفقهية فأدعو الله عزوجل ان يوفقني وإياكم لما فيه رضاه، ويطيل بقاؤكم في خير وعافية ومؤلف فهارس البخاري سرّ سرورا عظيما من تقدير مثلكم لكتابه، ويشكركم شكرا جمّا مع التحية الزاكية وأرجو أن لا تنسوني من صالح دعواتكم في مظان الإجابة

المخلص
محمد زاهد الكوثري
بشارع العباسية رقم ١٠٤
بالقاهرہ

مکتوب کا اردو ترجمہ ذیل ہے :

اخی فی اللہ، علامہ محدث وفقیہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، حفظہ اللہ، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مجھے آپ کا گرامی نامہ ۱۵ صفر ۱۳۶۹ھ کو ملا، اور اس خط کے ملنے میں بہت تاخیر اس لئے ہوئی کہ اس پر پتہ غلط درج تھا۔ بہرحال! آپ نے یہ مکتوب بھیج کر مجھ پر جو کرم فرمایا اس کی بنا پر مجھے بیحد مسرت ہوئی، اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ آپ خیریت سے ہیں، اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی سربراہی میں اپنے فاضل رفقاء کے ساتھ دینی خدمات میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا عثمانی کی عمردراز فرمائے اور آپ سب کو توفیق عطا فرمائے کہ اس نوخیز اسلامی مملکت میں جس کے ساتھ ہماری امیدیں وابستہ ہیں، اسلامی علوم کو فروغ دیں اور شریعت الٰہیہ کی بنیادیں قائم فرمادیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میرا پر خلوص سلام اور اعزاز واحترام کے دلی جذبات محقق العصر علامہ عثمانی تک پہنچادیں گے جو اس وقت تبحر علمی میں منفرد مقام رکھتے ہیں میری دعا ہے کہ جو علالت انہیں لاحق ہے، اللہ تعالیٰ

اس سے ان کو شفا کامل عطا فرمائے' ساتھ ہی ان کو یہ پیغام بھی پہنچا دیجئے کہ دنیا بھر کے علمی حلقے نہایت بے چینی سے اس بات کے منتظر ہیں کہ وہ اپنی ہمت عالیہ کا کچھ حصہ اپنی اس شرح کی تکمیل پر بھی خرچ فرمائیں جو ہر پہلو سے ایک عظیم شرح ہے۔[1]

میں مدت دراز سے آپ کی مبارک ذات سے متعارف ہونے کا مشتاق تھا' اس لئے کہ میں نے آپ کی بعض یادگار اور مفید تصانیف نہ صرف دیکھی ہیں' بلکہ ان سے استفادہ کیا ہے اور استاد بنوری اور استاذ بجنوری[2] اکثر ہماری مجلسوں کو آپ کے خوشگوار ذکر خیر سے معطر رکھتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یہ سن کر بیحد مسرت ہوئی کہ آپ نے اس مجلس کی رکنیت سنبھال لی ہے جو حضرت علامہ عثمانی کی سربراہی پر قائم ہوئی ہے[3]۔ اور آپ نے جو باتیں لکھی ہیں وہ درحقیقت آپ کی انتہائی تواضع کا نتیجہ ہیں' ورنہ علوم اسلامیہ میں آپ کے مقام بلند کو تمام اہل علم پہچانتے ہیں' خواہ وہ آپ سے قریب ہوں یا دور ہوں۔ اور ہم سب دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مشن میں مکمل کامیابی عطا فرمائے' اور آپ اسماعیلیوں' قادیانیوں اور ان جیسے دوسرے اندرونی و بیرونی فتنوں سے محفوظ رہیں۔

جہاں تک استفتاء کا تعلق ہے تو فتویٰ کے ماہر و محقق تو آپ خود ہیں۔ اور اس سلسلے میں آپ کے طویل تجربے نے آپ کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے جو صحیح معنی میں فقیہ النفس کا مقام ہے اور آپ نے اپنے مکتوب میں جو نکات اٹھائے ہیں' وہ نہایت وقیع ہیں .... (اس کے بعد

---

[1] صحیح مسلمؒ کی شرح "فتح الملہم" مراد ہے جو علامہ عثمانیؒ کی تالیف ہے اور جس کی صرف تین جلدیں شائع ہو سکی ہیں۔

[2] حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحبؒ اور حضرت مولانا احمد رضا صاحب بجنوری مراد ہیں جو اس وقت مصر میں تھے۔

[3] تعلیمات اسلامی بورڈ مراد ہے جو قیام پاکستان کے بعد اسلامی دستور کی ترتیب کے لئے حکومت کی طرف سے قائم کیا گیا تھا۔

اس مسئلے کے بارے میں اپنی رائے تحریر کر کے لکھا ہے کہ)......لیکن میں فتویٰ پر دستخط کرنے کی جرأت نہیں کروں گا' کیونکہ یہ آپ کی فقہی مہارت کے آگے ایک جسارت کے مترادف ہو گا۔ بس میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اپنی رضا کے مطابق کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے' اور آپ کو تا دیر خیر و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے۔

فہارس البخاری کے مؤلف اس بات پر بہت مسرور ہیں کہ آپ جیسی شخصیت نے ان کی کتاب کی قدردانی کی[1]۔ وہ سلام خلوص کے ساتھ آپ کے انتہائی شکر گزار ہیں اور میں بھی امیدوار ہوں کہ قبولیت کے خاص مواقع پر اپنی دعاؤں میں مجھے فراموش نہیں فرمائیں گے۔ والسلام

محمد زاہد الکوثری

۱۶/ صفر ۱۳۶۹ھ شارع العباسیۃ نمبر ۱۰۴

قاہرہ

اس مکتوب میں علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحبؒ کے علم و فضل کی محض رسمی تعریف نہیں کی۔ بلکہ باقاعدہ آپ کو "صحیح معنی میں فقیہ النفس" کا خطاب دیا ہے' اور جو لوگ علامہ زاہد کوثریؒ کے تبحر علمی سے واقف ہیں' انہیں اندازہ ہو گا کہ ان کے الفاظ کو کسی تصنع یا مبالغے پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت والد صاحبؒ کو اصطلاحاً "فقیہ النفس" کہنا تو علامہ کوثریؒ یا انہی کے پائے کے کسی عالم کا مقام تھا' لیکن اتنی بات کا مشاہدہ ہم خدام نے بھی کیا ہے کہ عمر کے آخری سالوں میں ضعف اور علالت کی بنا پر بار بار کتابوں کی مراجعت حضرتؒ کے لئے ممکن نہیں رہی تھی' چنانچہ اکثر و بیشتر آپ زبانی یا تحریری سوالات کے جواب مراجعت کتب کے بغیر ہی دیا کرتے تھے۔ بارہا یہ منظر بچشم خود دیکھا کہ فتاویٰ کی ڈاک کا ایک ڈھیر سامنے ہے اور جب جواب لکھنا شروع کیا تو لکھتے چلے گئے اور کسی بھی مسئلے میں مراجعت کتب کی ضرورت پیش نہیں آئی' البتہ جہاں ضرورت پیش آتی تو اس خاص فتوے کو الگ کر لیتے اور آپ کے دستی بیگ

---

[1] "فہارس البخاری" کے مولف علامہ کوثری کے شاگرد ہیں' انہوں نے یہ کتاب بغرض تبصرہ والد صاحبؒ کو بھیجی تھی' اور حضرت والد صاحبؒ نے اس پر تقریظ تحریر فرمائی تھی جو شائع ہو چکی ہے۔

میں ایک بڑا لفافہ عموماً رکھا رہتا تھا جس پر "غور طلب فتاویٰ" کا عنوان درج تھا' جب کبھی کسی مسئلے میں شبہ ہوتا تو وہ اس لفافے میں چلا جاتا' پھر کسی فرصت کے وقت خود یا کسی اور کے ذریعے متعلقہ کتب کی مراجعت کے بعد اس کا جواب دیتے تھے۔

انہی غور طلب فتاویٰ کے سلسلے میں اس بات کا بارہا مشاہدہ ہوا کہ کتابوں کی مراجعت سے پہلے آپ ابتداءً اپنا جو خیال ظاہر فرماتے' کتابوں کی طویل ورق گردانی کے بعد اس خیال ہی کی تائید ہوتی تھی اور اس وقت اندازہ ہوتا کہ اس سوال کو محض احتیاط کی خاطر روکا گیا تھا' ورنہ اس کا صحیح جواب اس مذاق سلیم کے پاس پہلے سے موجود تھا جو اللہ تعالیٰ نے کثرت ممارست سے وہبی طور پر پیدا فرمادیا تھا۔

جیسا کہ احقر نے پہلے عرض کیا' مہینے میں ایک مرتبہ دارالعلوم کراچی' جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن اور اشرف المدارس کے حضرات اہل فتویٰ کی مجلس ہوا کرتی تھی جس میں مختلف غور طلب فقہی مسائل پر مشورہ ہوا کرتا تھا۔ اس مجلس میں کئی بار اس کا تجربہ ہوا کہ حضرت والد صاحبؒ جو موقف اختیار فرماتے' وہ کتب فقہ کے ظاہر کے خلاف معلوم ہوتا تھا' چنانچہ ہم جیسے اہل ظاہر اس پر اپنے اشکالات پیش کرتے رہتے' لیکن آخر میں کسی واضح دلیل سے ثابت ہوجاتا کہ بات وہی صحیح تھی جو حضرتؒ نے ابتداءً میں ارشاد فرمادی تھی۔

ایک مرتبہ حضرتؒ علیل تھے' مجلس کا دن آگیا' اور شرکائے مجلس دارالعلوم تشریف لے آئے' حضرت والد صاحبؒ نے بذات خود شرکت سے معذرت فرمائی' لیکن ہم لوگوں سے فرمایا کہ کام ملتوی نہ کریں' چنانچہ ہم سب کام میں لگ گئے' اتفاق سے مسئلہ کوئی پیچیدہ قسم کا تھا' اور صبح سے شام تک کا پورا وقت اسی ایک مسئلے کی تحقیق اور اس پر بحث ومباحثہ میں گزر گیا۔ اس دوران تمام حاضرین نے فقہ وفتوی کی تمام متعلقہ کتابیں بھی دیکھیں' شروح حدیث کی طرف بھی رجوع کیا' اور شام کو تمام حضرات ایک فیصلے پر متفق ہوئے اور اس کی تائید میں کتب فقہ کی عبارتیں نقل کرلیں' البتہ پوری بحث کو قلمبند کرنے کا کام مؤخر کردیا گیا۔ عصر کے بعد جب حضرتؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو آپ نے دن بھر کی کارروائی کا خلاصہ معلوم فرمایا' ہم جس نتیجے پر پہنچے تھے' ہم نے وہ عرض کردیا' حضرتؒ نے سن کر فرمایا : "نہیں' یہ بات دل کو نہیں لگتی۔" عرض کیا کہ "تمام فقہی کتب سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا : "دوبارہ غور کرنا چاہئے' یہ بات صحیح معلوم نہیں ہورہی۔" اس وقت

چونکہ حضرتؒ کی طبیعت ناساز تھی، اور طویل گفتگو مناسب نہ تھی، اس لئے ہم نے سوچا کہ کسی اور موقع پر عرض کریں گے، چنانچہ ایک روز جب کہ طبیعت نسبتاً بہتر تھی، ہم نے ان تمام کتابوں کے حوالے سے بات کرنی چاہی تو آپ نے وہ حوالے دیکھے بغیر فرمایا کہ "نہیں بھئی وہ بات بالکل غلط ہے، پھر سے دیکھو۔" ہمیں خیال ہوا کہ آپ نے وہ حوالے دیکھے بغیر فیصلہ کیسے فرما دیا؟ چنانچہ ہم نے مکرّر عرض کیا کہ "کتب فقہ کی یہ عبارتیں آپ ملاحظہ فرمائیں، ان سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے"۔ اس مرتبہ آپ نے قدرے تکدّر کے ساتھ فرمایا "نہیں بھئی، یہ بات بالکل غلط ہے اور اگر تم لوگ اس پر متفق ہو چکے ہو تو کم از کم میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔" بات بظاہر بڑی عجیب تھی کہ نہ آپ وہ حوالے دیکھنے پر آمادہ تھے اور نہ اپنے موقف کے لئے کوئی دلیل بیان فرما رہے تھے۔ لیکن اس موقف پر خلاف معمول جزم اتنا تھا کہ اس سے سرِ مو ہٹنے کے لئے تیار نہ تھے آپ کا عام معمول یہ تھا کہ اگر ہم جیسے طفل مکتب بھی کوئی معقول بات کہہ دیتے تو اسے فوراً قبول فرما لیتے تھے اور دلیل کے مقابلے میں اپنی کسی رائے پر جمنے کا تو وہاں سوال ہی نہ تھا، لہٰذا یہ طرز عمل ہمارے لئے عجیب اور حیران کن ضرور تھا، لیکن ساتھ ہی اس بات پر بھی یقین تھا کہ یہ جزم بلاوجہ نہیں ہے۔ چنانچہ جب آئندہ مجلس میں تمام ارکان نے مسئلے پر مکرر غور کیا اور دوبارہ کتابیں دیکھنی شروع کیں تو آخر میں نتیجہ وہی نکلا جو حضرت والد صاحب کا موقف تھا، اور اس وقت اندازہ ہوا کہ اگر ہم اپنے سابقہ موقف پر قائم رہتے تو یہ کتنی سنگین غلطی ہوتی۔

بات یہ نہیں تھی کہ فقہاء کی جو عبارتیں بعد میں ہمارے سامنے آئیں، وہ پہلے سے حضرت والد صاحبؒ کی نگاہ میں تھیں، بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ ہمارے سابقہ فیصلے کو حضرت والد صاحبؒ کے مذاق سلیم نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ محنت، للّٰہیت اور بزرگوں کی صحبت و تربیت کے نتیجے میں اپنے خاص بندوں کے قلب کو وہ کسوٹی عطا فرما دیتا ہے جو صحیح و غلط کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

فتویٰ کے معاملے میں خصوصی مذاق کی چند باتیں

(۹) اب میں حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مذاق فتویٰ کے بارے میں آپ ہی سے سنی ہوئی چند متفرق باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت والد صاحبؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کرلینے سے انسان فقیہ یا مفتی نہیں بنتا' میں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے ہیں جنہیں فقہی جزئیات ہی نہیں' ان کی عبارتیں بھی ازبر تھیں' لیکن ان میں فتویٰ کی مناسبت نظر نہیں آئی۔ وجہ یہ ہے کہ درحقیقت "فقہ" کے معنی "سمجھ" کے ہیں' اور فقیہ وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمادی ہو' اور یہ سمجھ محض وسعت مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے پیدا نہیں ہوتی' بلکہ اس کے لئے کسی ماہر فقیہ کی صحبت اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے۔

یہ بات احقر نے حضرت والد صاحبؒ سے بارہا سنی' اور ایک آدھ مرتبہ اس کی تشریح و تفصیل بھی سمجھنی چاہی کہ وہ کیا باتیں ہیں جو محض مطالعے یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں۔ لیکن حضرت والد صاحبؒ نے اس سوال کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر وہ باتیں بیان میں آسکتیں تو پھر انہیں سیکھنے کے لئے کسی سے تربیت لینے کی ضرورت نہ ہوتی اب ان کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ انہیں منضبط شکل میں مدون نہیں کیا جاسکتا' اور نہ متعین الفاظ میں ان کی تعبیر و تشریح ممکن ہے گویا۔

بسیار شیوہ ہا است بتاں راکہ نام نیست

ان باتوں کے حصول کا طریقہ ہی یہ ہے کہ کسی ماہر فقیہ کے ساتھ رہ کر اس کے انداز فکر و نظر کا مشاہدہ کیا جائے' اس طرح مدت کے تجربے اور مشاہدے سے وہ انداز فکر خود بخود زیر تربیت شخص کی طرف منتقل ہو جاتا۔ بشرطیکہ جانبین میں مناسبت ہو' اور سیکھنے والا شخص باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی سیکھنا چاہتا ہو۔

(۱۰) حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ اکابر دیوبند کے مسلک کے مطابق تقلید شخصی کے نہ صرف قائل تھے' بلکہ اس دور ہوا وہوس میں اسی کو سلامتی کا راستہ سمجھتے تھے' اور جب کبھی ائمہ اربعہ کے درمیان دلائل کے محاکمے کا سوال آتا تو فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہمارا منصب نہیں ہے' کیونکہ محاکمہ کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جانبین کے علمی مقام سے اگر بلند تر نہ ہو تو کم از کم ان کے مساوی تو ہو' اور آج اس مساوات کا تصوّر ہی نہیں کیا جاسکتا۔

البتہ ساتھ ہی حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے کہ "تقلید

شخصی کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ بلکہ ایک انتظامی فتویٰ ہے[۱]" جس کا حاصل یہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لئے وزنی دلائل موجود ہیں، لیکن اگر ہر شخص کو یہ کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جب جس امام کے مسلک کو چاہے، اختیار کرے تو ہر شخص اپنی آسانی کی خاطر آج ایک مسلک پر عمل کرلے گا، کل دوسرے مسلک پر اور اس طرح اتباع خداوندی کے بجائے اتباع نفس کا دروازہ کھل جائے گا۔

لیکن چونکہ چاروں مذاہب بلاشبہ برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس دلائل موجود ہیں، اس لئے اگر مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہد کے مسلک پر فتویٰ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ نے حضرت تھانوی کو یہ وصیت کی تھی اور حضرت تھانویؒ نے ہم سے فرمایا کہ آجکل معاملات پیچیدہ ہوگئے ہیں اور اس کی وجہ سے دیندار مسلمان تنگی کا شکار ہیں، اس لئے خاص طور سے بیع و شراء اور شرکت وغیرہ کے معاملات میں جہاں بلویٰ عام ہو، وہاں ائمہ اربعہ میں سے جس امام کے مذاہب میں عام لوگوں کے لئے گنجائش کا پہلو ہو، اس کو فتویٰ کے لئے اختیار کرلیا جائے۔

لیکن حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ کسی دوسرے امام کا قول اختیار کرنے کے لئے چند باتوں کا اطمینان کرلینا ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ واقعۃً مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت متحقق ہے یا نہیں، ایسا نہ ہو کہ محض تن آسانی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرلیا جائے، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس اطمینان کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایک مفتی خود رائی کے ساتھ یہ فیصلہ نہ کرے، بلکہ دوسرے اہل فتویٰ حضرات سے مشورہ کرے، اگر وہ بھی متفق ہوں تو اتفاق رائے کے ساتھ ایسا فتویٰ دیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس امام کا قول اختیار کیا جارہا ہے اس کی پوری تفصیلات براہ راست اس مذہب کے اہل فتویٰ علماء سے معلوم کی جائیں، محض کتابوں میں دیکھنے پر اکتفا نہ کیا جائے، کیونکہ بسا اوقات اس قول کی بعض ضروری تفصیلات عام کتابوں میں مذکور نہیں ہوتیں اور ان کے نظرانداز کردینے سے تلفیق کا اندیشہ رہتا ہے۔

---

[۱] اس جملے کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو جواہر الفقہ میں حضرت والد صاحبؒ کا رسالہ "تقلید شخصی" اور احقر کا کتابچہ "تقلید کی شرعی حیثیت"۔

تیسری بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ سے خروج نہ کیا جائے کیونکہ ان حضرات کے علاوہ کسی بھی مجتہد کا مذہب مدون شکل میں ہم تک نہیں پہنچا اور نہ ان کے متبعین اتنے ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی قول استفاضہ یا تواتر کی حد تک پہنچ جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے "عقدا لجید" میں ائمہ اربعہ سے باہر جانے کے مفاسد تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔

چنانچہ بعض مصیبت زدہ خواتین کے لئے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے مالکی مذہب پر فتویٰ دینے کا ارادہ کیا تو ان تمام باتوں کو پوری احتیاط کے ساتھ مدّ نظر رکھا اور براہ راست مالکی علماء سے خط وکتابت کے ذریعے مذہب کی تفصیلات معلوم کیں اور تمام علمائے ہند سے استصواب کے بعد فتویٰ شائع فرمایا۔

(۱۱) حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ علامہ ابن عابدین شامیؒ انتہائی وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود اس قدر تقویٰ شعار اور محتاط بزرگ ہیں کہ عام طور سے اپنی ذمہ داری پر کوئی مسئلہ بیان نہیں کرتے' بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنے سے پہلے کی کتابوں میں سے کسی نہ کسی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں۔ اگر ان اقوال میں بظاہر تعارض ہو تو ان کو رفع کرنے کے لئے بھی حتی الامکان کسی دوسرے فقیہ کے قول کا سہارا لیتے ہیں اور جب تک بالکل مجبوری نہ ہو جائے خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے۔ اور جہاں ظاہر فرماتے ہیں وہاں بھی بالعموم آخر میں "تامل یا تدبر" کہہ کر خود بری ہو جاتے ہیں' اور ذمہ داری پڑھنے والے پر ڈال دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات الجھے ہوئے مسائل میں ہم جیسے لوگوں کو ان کی کتاب سے مکمل شفاء نہیں ہوتی۔

لیکن فرمایا کرتے تھے کہ یہ طریقہ ردالمحتار' میں تو رہا ہے' مگر چونکہ علامہ شامیؒ نے البحرالرائق کا حاشیہ منحۃ الخالق اور تنقیح الحامدیہ بعد میں لکھا ہے' اس لئے ان کتابوں میں مسائل زیادہ منقح انداز میں آئے ہیں جنہیں پڑھ کر فیصلہ کن بات معلوم ہو جاتی ہے۔

(۱۲) فقہاء کرامؒ نے فقہ کے جو متون مرتب فرمائے ہیں ان کی عبارتیں انتہائی جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان متون میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے لئے اتنے ہی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جتنے ناگزیر ہوں' ان کا کوئی لفظ زائد نہیں ہوتا بلکہ' اس سے مسئلے کی کسی نہ کسی شرط کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء حنفیہؒ

قرآن و سنت کی نصوص میں تو مفہوم مخالف کو حجت نہیں مانتے' کیونکہ قرآن و سنت کا اسلوب احکام کے بیان کے ساتھ ساتھ وعظ و تذکیر کے پہلو کو بھی ساتھ لئے ہوئے ہے اور اس میں بعض الفاظ اسی نقطہ نظر سے بڑھائے جاتے ہیں' لیکن فقہاء کی عبارتیں صرف قانونی انداز کی عبارتیں ہیں۔ اس لئے ان عبارتوں میں مفہوم مخالف کا معتبر ہونا خود فقہاء حنفیہؒ نے تسلیم کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ فقہاء کے کلام کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے قانونی مقتضیات پر غور کرکے کوئی نتیجہ نکالا جائے۔ لیکن ان الفاظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں بعض اوقات کئی احتمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک احتمال کو اختیار کرنے میں ایک فقیہ اور مفتی کو اپنی بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے۔ بعض حضرات کسی لفظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں اس کے لغوی مفہوم اور ٹھیٹھ منطقی نتائج کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس سے مسئلے کی علت اور اس کا صحیح سیاق پس پشت چلا جاتا ہے' اور بعض حضرات اس لفظ کے ٹھیٹھ منطقی نتائج پر زور دینے کے بجائے اس سیاق کو مد نظر رکھتے ہیں جن میں وہ بولا گیا ہے' خواہ اس سے لفظ کے منطقی نتائج پورے نہ ہوتے ہوں۔ ان دونوں میں سے حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا مذاق دوسرے طرز عمل کے مطابق تھا۔

ایک مثال سے یہ بات واضح ہو سکے گی۔ فقہاء حنفیہ کے یہاں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر نابالغ کا نکاح اس کے باپ یا دادا نے کیا ہو تو اسے خیار بلوغ حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے ساتھ ہی درمختار وغیرہ میں ایک استثنا مذکور ہے کہ الا اذا کان الاب معروفا بسوء اختیارہ مجانۃ وفسقا (یعنی جب باپ فسق و فجور اور لالچ کی وجہ سے اولاد کی بدخواہی میں معروف ہو تو یہ حکم نہیں ہوگا' بلکہ اس صورت میں اولاد کو خیار بلوغ حاصل ہوگا)

یہاں فقہاءؒ نے صرف اتنا نہیں فرمایا کہ باپ اولاد کا بدخواہ ہو' بلکہ یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس بدخواہی میں معروف ہو' لہٰذا لفظ "معروف" کے قانونی مقتضیات پر عمل تو ضروری ہے' لیکن جو حضرات ان قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں لفظ کے ٹھیٹھ منطقی لوازم پر زور دیتے ہیں' انہوں نے اس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی شخص کو "معروف بسو الاختیار" (اولاد کی بدخواہی میں معروف) اسی وقت کہا جائے گا جب اس نے کم از کم ایک مرتبہ اپنی کسی اولاد کا نکاح بدخواہی سے صرف لالچ کی بنا پر کردیا ہو۔ اور جس شخص نے اب

تک اپنی کسی لڑکی کا نکاح اس طرح نہ کیا ہو وہ "معروف بسوء الاختیار" نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا اگر کوئی باپ پہلی بار اپنی لڑکی کا نکاح لالچ سے کر رہا ہو تو وہ "سیئی الاختیار" تو ہے لیکن "معروف بسوء الاختیار" نہیں ہے' اس لئے اس کی لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہیں ہو گا۔ ہاں اگر وہ اس کے بعد دوسری لڑکی کا نکاح اسی طرح کرے تو چونکہ اب وہ معروف بسوء الاختیار بن گیا ہے۔ اس لئے دوسری لڑکی کو خیار بلوغ مل جائے گا۔

لیکن حضرت والد صاحبؒ نے جواہر الفقہ کے ایک رسالے میں اس نقطہ نظر سے اختلاف فرمایا ہے' ان کا موقف یہ ہے کہ "معروف بسوء الاختیار" کی یہ منطقی تعبیر کہ جب تک کسی لڑکی کی کم از کم ایک بہن باپ کی بدخواہی کی بھینٹ نہ چڑھ چکی ہو' اس وقت تک اسے خیار بلوغ حاصل نہ ہو' اس سیاق کے بالکل خلاف ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے' سیاق یہ ہے کہ اولاد کا خیار بلوغ باپ کی مظنونہ شفقت کے مد نظر ساقط کیا گیا تھا۔ لیکن جب سوء اختیار سے اس شفقت کا فقدان ثابت ہو گیا تو خیار بلوغ لوٹ آئے گا۔ اس موقع پر فقہاء نے "معروف بسوء الاختیار" کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ بسوء اختیار کا فیصلہ محض کسی کی شخصی رائے سے نہیں ہونا چاہئے' بلکہ باپ کی بدخواہی اتنی واضح ہونی چاہئے کہ وہ لوگوں میں اس حیثیت سے معروف ہو۔

(۱۳) حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شریعت اسلامی چونکہ صرف شہریوں اور پڑھے لکھے افراد کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ہر ان پڑھ دیہاتی اور دور دراز علاقے کا رہنے والا بھی اس کا اتنا ہی مخاطب ہے جتنا ایک تعلیم یافتہ انسان' اس لئے شریعت کے احکام میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنے کے لئے لمبے چوڑے حساب و کتاب' ریاضی کے باریک فارمولوں اور فلسفیانہ تدقیقات کی ضرورت پیش نہ آئے۔ حضرت والد صاحبؒ نے یہ بات اپنے مضامین میں بھی تحریر فرمائی ہے۔ چنانچہ رسالہ "سمت قبلہ" میں لکھتے ہیں۔

> "شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے تمام احکام کی بنیاد یسر و سہولت اور سادگی و بے تکلفی پر ہے' فلسفیانہ تدقیقات پر نہیں' کیونکہ دائرہ حکومت اس شریعت کا تمام عالم کے بحروبر' اسود و احمر' شہری و دیہاتی آبادیوں اور ان کے مکان پر حاوی ہے۔ اسلامی فرائض نماز و روزہ وغیرہ

جس طرح شہریوں اور تعلیم یافتہ طبقات پر عائد ہیں۔ اسی طرح دیہاتیوں اور پہاڑ کے دروں اور جزائر کے رہنے والے ناخواندہ و ناواقف لوگوں پر بھی عائد ہیں۔ اور جو احکام اس درجہ عام ہوں' ان میں مقتضا عقل وحکمت و رحمت کا یہی ہے کہ ان کو تدقیقات اور قواعد ریاضیہ یا آلات رصدیہ پر موقوف نہ رکھا جائے' تاکہ ہر خاص و عام' خواندہ و ناخواندہ باآسانی اپنے فرائض انجام دے سکے۔ روزہ رمضان کا مدار چاند دیکھنے پر رکھا گیا ہے' حسابات ریاضیہ پر نہیں' مہینے قمری رکھے گئے ہیں جن کا مدار رؤیت ہلال پر ہے۔ شمسی مہینے جن کا مدار خاص حسابات ریاضیہ پر ہے' عام احکام شرعیہ میں ان کو نہیں لیا گیا' اسی طرح احکام اسلامیہ کے تتبع سے بکثرت اس کے نظائر معلوم کئے جاسکتے ہیں (جواہر الفقہ ج ۱ ص ۲۵۸)

فتویٰ لکھنے سے پہلے

(۱۴) حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح کسی مسئلے کا حکم معلوم کرنا ایک اہم کام ہے۔ اسی طرح فتویٰ نویسی ایک مستقل فن ہے جس کے لئے مفتی کو بہت سی باتوں کی رعایت رکھنی پڑتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے مفتی کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مستفتی کا سوال قابل جواب ہے یا نہیں؟ اور بعض اوقات سوال کے انداز سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کا مقصد عمل کرنا یا علم میں اضافہ کرنا نہیں' بلکہ اپنے کسی مخالف کو زیر کرنا ہے' یا حالات ایسے ہیں کہ اس سوال کے جواب سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں استفتاء کے جواب سے گریز کرنا مناسب ہوتا ہے' مثلاً ایک مرتبہ سوال آیا کہ ہماری مسجد کے امام صاحب فلاں فلاں آداب کا خیال نہیں رکھتے' آیا انہیں ایسا کرنا چاہئے یا نہیں؟ سوال کسی مقتدی کی طرف سے تھا اور اس کے انداز سے حضرت والد صاحبؒ کو یہ غالب گمان ہو گیا کہ اس استفتاء کا مقصد امام صاحب کو حق کی دعوت دینا یا فہمائش کرنا نہیں' بلکہ ان کی تحقیر اور ان کے بعض خلاف احتیاط امور کی تشہیر ہے۔ چنانچہ حضرت والد صاحبؒ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا یہ سوال تو خود امام صاحب کے پوچھنے کے ہیں'

ان سے کہئے کہ وہ تحریراً یا زبانی معلوم فرمالیں اور اس طرح یہ ممکنہ فتنہ فرو ہو گیا۔

اسی طرح حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ جن سوالات پر دنیا و آخرت کا کوئی عملی فائدہ مرتب نہ ہو' ان کی ہمت شکنی کی جائے' کیونکہ ایک عرصے سے لوگوں میں یہ مزاج ابھرا ہے کہ دین کے وہ عملی مسائل جن پر زندگی کی درستی اور آخرت کی نجات موقوف ہے' ان سے تو غافل اور بے خبر رہتے ہیں' اور بے فائدہ نظریاتی بحثوں میں نہ صرف وقت ضائع کرتے ہیں' بلکہ ان کی بنیاد پر باقاعدہ محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں جس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحبؒ ایسے سوالات کے جواب میں فتویٰ لکھنے کے بجائے ایسی نصیحت فرماتے تھے جس سے عمل کا دھیان اور آخرت کی فکر پیدا ہو۔ مثلاً ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ "یزید کی مغفرت ہو گی یا نہیں؟" آپ نے جواب دیا "یزید سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنی چاہئے" ایک صاحب نے ایک مشہور شخصیت کی کچھ باتیں لکھ کر سوال کیا کہ "کیا وہ ان امور کی وجہ سے فاسق ہو گئے؟" آپ نے فرمایا۔ "مجھے ابھی تک اپنے فسق کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا میں کسی دوسرے کے بارے میں کیا فیصلہ کروں؟" غرض اگر عوام کی طرف سے اس قسم کے سوالات آتے کہ عرش افضل ہے یا روضہ اقدس؟ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے؟ زلیخا سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح ہوا تھا یا نہیں؟ اصحاب کہف کی صحیح تعداد کیا تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین مومن تھے یا نہیں؟ آپ کے فضلات طاہر تھے یا نہیں؟ اور والد صاحبؒ کو اندازہ ہوتا کہ یہ سوالات بلا ضرورت محض بحث ومباحثے کی خاطر پوچھے جا رہے ہیں تو عموماً آپ ان کا جواب دینے کے بجائے یہ تحریر فرماتے تھے کہ :

"ان باتوں کے معلوم ہونے پر ایمان و عمل کا کوئی مسئلہ موقوف نہیں' ان مسائل پر بحث ومباحثے میں وقت خرچ کرنے کے بجائے وہ کام کیجئے جو آخرت میں کام آئے" اور بعض اوقات صرف اتنے جواب پر اکتفا فرماتے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ" "یعنی انسان کے اچھا مسلمان بننے کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے۔"

ایک مرتبہ ملک میں "حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے مسئلے پر بحث ومباحثہ کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ بستی بستی مناظرے منعقد ہونے لگے' اور فریقین کی طرف سے

مناظرانہ کتابوں کا ایک انبار تیار ہوگیا' حضرت والد صاحبؒ کے پاس اس مسئلے پر سوالات کی بھرمار ہوئی تو اس زمانے میں آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ اگر سوال کسی ذی علم شخص کی طرف سے آیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ اس کا مقصد اپنے کسی شبہے کو دور کرنا یا واقعۃً علمی تحقیق کرنا ہے تو آپ اس کا جواب حسب ضرورت اجمال یا تفصیل کے ساتھ دے دیتے' لیکن عموماً جو سوالات عوام کی طرف سے آتے تھے ان کا جواب یہ دے دیتے کہ حیات النبیؐ کے مسئلے کی تفصیلات کا جاننا آخرت کی نجات کے لئے کوئی ضروری نہیں ہے' لہٰذا اس بحث میں پڑنے کے بجائے شریعت کے عملی احکام کا علم حاصل کرنے میں وقت صرف کیجئے۔ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ

(۱۵) اسی طرح آپ نے بارہا فرمایا کہ مفتی کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس کے فتوے کا اثر اور نتیجہ کیا ہوگا؟ چنانچہ بعض اوقات کسی مسئلے کا ٹھیٹھ فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک چیز فی نفسہ مباح ہے' لیکن اس کی کھلی چھوٹ دے دینے سے اندیشہ یہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی' اور لوگ اپنی حدود پر قائم نہیں رہیں گے ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو' اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر مفتی کو اپنا جواب فتوے کے بجائے مشورے کے طور پر لکھنا چاہئے۔ ایسے مواقع پر اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ "فلاں عمل مناسب نہیں۔ یا درست نہیں۔" یا "اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔"

اسی ذیل میں ایک مرتبہ فرمایا کہ اس قسم کے فتوے بعض اوقات زمانوں کے اختلاف سے بالکل بدل جاتے ہیں' اس کی بنا پر بعض لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ علماء اپنی مرضی سے احکام شریعت میں ردوبدل کرتے رہتے ہیں' حالانکہ درحقیقت وہ شرعی احکام کی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ حالات کے لحاظ سے نسخے اور تدبیر کی تبدیلی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ سے کسی نے کہا کہ "حضرت! یہ کیا بات ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا تو اکابر علمائے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت کے فتوے دیئے۔ لیکن اب آپ حضرات یہ کہتے ہیں کہ مفاسد سے اجتناب کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اس کے جواب میں

حضرت علامہ عثمانیؒ نے جوبات ارشاد فرمائی وہ لوح دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔ فرمایا کہ "یہ شرعی حکم کی تبدیلی نہ تھی' بلکہ بات یہ ہے کہ جب کسی علاقے پر کسی وبا کے مسلط ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اطباء ایسی تدبیریں بتاتے ہیں جن سے اس دباؤ کو روکا جاسکے' لیکن جب وبا آجاتی ہے تو پھر معالجوں کی تدبیر بدل جاتی ہے' اور اس وقت ایسے نسخے بتائے جاتے ہیں جن کے ذریعے وہ بیماری آنے کے بعد شفا حاصل ہو' بالکل یہی معاملہ یہاں بھی ہوا ہے' واقعہ یہ ہے کہ جدید علم وفنون یا کسی زبان کی تحصیل کو بذات خود کبھی کسی نے حرام نہیں کہا' لیکن اس وقت چونکہ علماء کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ علوم وفنون یا انگریزی زبان تنہا نہیں آئیں گے' بلکہ ملحدانہ عقائد و نظریات اور دین بیزاری کی وبا ساتھ لائیں گے جس کا مشاہدہ بعد میں سب کو ہوگیا' اس لئے شروع میں انہوں نے اس وبا کو روکنے کی تدبیر کی اور بہت سے مسلمانوں کو بچالیا لیکن جب یہ وباء عالمگیر ہوگئی تو پھر تدبیر بدل گئی' اور وہ یہ کہ ان علوم وفنون یا اس زبان کو حتی الوسع ان بیماریوں سے پاک کرکے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ غرض یہ مختلف حالات کی مختلف تدبیریں تھیں' ٹھیٹھ معنی میں شرعی حکم کی تبدیلی نہیں۔

فتویٰ نویسی میں آپ کا خصوصی انداز

(۱۶) حضرت والد صاحب قدس سرہ نے فتویٰ نویسی کے انداز میں بھی عام روش سے ہٹ کر اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے اہم تبدیلیاں فرمائی ہیں' آپ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کو یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس کے فتوے کو مخاطب ٹھیک ٹھیک سمجھ لے' اور نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو' پہلے زمانے میں چونکہ علم دین کا چرچا تھا اور علماء کی کثرت تھی' اس لئے لوگ علمی و فقہی اصطلاح واسلوب سے اتنے نامانوس نہ تھے' چنانچہ مفتی حضرات اپنے جوابات میں بلاتکلف فقہی اصطلاحات استعمال کرلیتے تھے۔ مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر ان اصطلاحات سے مانوس ہوتا تھا۔ اس لئے بحیثیت مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا تھا' اور اگر کوئی بات خود نہ سمجھتا تو ہر بستی میں ایسے لوگ موجود تھے جو اسے فتویٰ کا مطلب سمجھا سکیں۔ اب ہماری شامت اعمال سے حالت یہ ہوگئی ہے کہ علم دین اور فقہ سے مناسبت باقی نہیں رہی' اور اہل علم کی تعداد بھی کم ہوگئی ہے' اس لیے اب اگر سوال

کرنے والا کوئی عام آدمی ہو تو جواب کی عبارت اس کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہئے۔

مثلاً میراث کے مسائل کا جواب دیتے ہوئے عام طور سے مفتی حضرات یہ جملہ لکھتے رہے ہیں کہ "مرحوم کا جملہ ترکہ بعد تقدیم حقوق متقدمہ علی الارث حسب ذیل طریقے پر تقسیم ہو گا۔" اس فارمولے کا مطلب پہلے ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہو تا تھا' لیکن اب اگر یہ جملہ کسی گریجویٹ بلکہ پی ایچ ڈی کے سامنے بھی آجائے تو وہ اس کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا' اور اس سے میراث کی شرعی تقسیم میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔ اول تو آج لوگوں کو یہ بھی احساس نہیں رہا کہ میت کے ترکے میں کیا کیا چیزیں شامل ہوتی ہیں؟ چنانچہ عام طور سے میت کے ذاتی استعمال کی چھوٹی موٹی چیزوں بلکہ بعض اوقات گھر کے سازوسامان تک کو ترکے کی تقسیم میں شامل نہیں کیا جاتا۔ پھر نہ لوگوں کو "حقوق متقدمہ علی الارث" کا مطلب معلوم ہے' اور نہ ان کے مصداق کا پتہ ہے' اس لئے حضرت والد صاحبؒ نے میراث کے مسائل میں اس جملے کے بجائے حسب ذیل طویل عبارت لکھوانی شروع کی کہ :

> "صورت مسئولہ میں مرحوم نے جو کچھ نقدی' زیور' جائیداد یا چھوٹا بڑا سامان چھوڑا ہو اس میں سے پہلے مرحوم کی تجہیز و تکفین کے متوسط اخراجات نکالے جائیں' پھر اگر مرحوم کے ذمے کچھ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے' اور بیوی کا مہر اگر ابھی تک ادا نہیں کیا تو وہ بھی دَین میں شامل ہے' اس کو ادا کیا جائے' پھر اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کسی غیر وارث کے حق میں کی ہو تو ۳/۱ کی حد تک اس کے مطابق عمل کیا جائے' اس کے بعد جو ترکہ بچے اسے حسب ذیل تفصیل کے مطابق تقسیم کیا جائے۔"

یہ تو ایک مثال تھی' ورنہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ نویسی کے پورے اسلوب میں عام روش سے ہٹ کر ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ایک طرف فتویٰ کی شوکت اور فقہی باریکیاں برقرار رہیں' اور دوسری طرف اس کی عبارت میں سلاست اور عام فہمی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ جو حضرات آپ سے فتویٰ کی تربیت لیتے ان کو بھی آپ اس بات کی تاکید فرماتے' اس کی باقاعدہ مشق کراتے اور ان کی عبارت کی اصلاح پر کافی وقت خرچ کرتے تھے۔

(۱۷) مفصل فتوؤں میں بعض اوقات مسئلے کے احکام، اس کے دلائل اور شبہات کے جواب اس طرح گڈ مڈ ہو جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے اور سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے نہ صرف پورا فتویٰ پڑھنا پڑتا ہے، بلکہ بعض اوقات پورے فتوے کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا۔ حضرت والد صاحبؒ کا انداز فتویٰ نویسی جس کی آپ دوسروں کو بھی تاکید فرماتے تھے، اس سے مختلف تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ فتویٰ میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئیں، تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو، وہ بہ آسانی حکم معلوم کرلے اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے۔ فتوے میں عام آدمی کے لئے تو صرف حکم ہی ہوتا ہے، اور دلائل اہل علم کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک عام آدمی کو فتوے کے شروع ہی میں مختصراً یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جانی چاہئے کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کا مختصر جواب کیا ہے؟ اس جواب کے بعد اہل علم کے لئے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جواب جتنی تفصیل سے چاہیں دے دیئے جائیں۔

چنانچہ حضرت والد صاحبؒ کے فتوؤں میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ فتوے کے شروع یا آخر میں بالکل نمایاں اور ممتاز طریقے پر مسئلے کا واضح جواب لکھ دیتے ہیں اور زیادہ تر یہ جواب شروع میں ہوتا ہے۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ قدیم فقہاء اور مفتی حضرات کا طریقہ یہی تھا اور ایک روز احقر کو غالباً حضرت شاہ جلال صاحب تھانیسریؒ کے بعض فتاویٰ دکھائے جو اپنے موضوع پر مفصل فتاویٰ تھے، لیکن ان کا طریقہ یہی تھا کہ سائل نے کسی چیز کے بارے میں یہ پوچھا تھا کہ ہل یجوز؟ اس پر حضرت شاہ جلال صاحبؒ نے شروع میں لکھا تھا: الجواب: نعم، یجوز، اور اس کے بعد دلائل کی مفصل بحث فرمائی تھی، حضرت والد صاحبؒ نے اس کو بطور مثال پیش کرکے فرمایا کہ یہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب ہے کہ پڑھنے والے کو سوال کا جواب تو پہلے ایک ہی لفظ سے مل گیا۔ اب اگر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے اور نہیں پڑھنا چاہتا تو چھوڑ دے۔ نرا حکم معلوم کرنے کے لئے پورا مفصل فتویٰ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۸) اسی طرح سوال بعض اوقات تہ در تہ ہوتا ہے، اور سوال کرنے والا تمام باتوں کو گڈ مڈ

کرکے پوچھتا ہے' ایسے مواقع پر حضرت والد صاحبؒ کا طریقہ یہ تھا کہ جواب میں پہلے سوال کا تجزیہ خود فرمالیتے اور یہ تنقیح فرمادیتے کہ اس مسئلے میں فلاں فلاں باتیں قابل غور ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر نمبروار بحث فرماتے تھے' اس طرح مسئلے کے تمام گوشے پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتے تھے' اور مسئلے کی تفہیم میں کوئی پیچیدگی باقی نہ رہتی تھی۔

فتویٰ کے کام کی عظمت واہمیت

حضرت والد صاحب قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے یوں تو دین کی بے شمار خدمتیں لیں' جن میں تدریس' تصنیف' وعظ' اصلاح وارشاد' اقامت دین اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے سیاسی جدوجہد وغیرہ۔ لیکن ان تمام خدمات میں سے وہ خدمت جو آپ کی زندگی کا جز بن گئی تھی' فتویٰ کی خدمت تھی جو "مفتی" کے منصب پر فائز ہونے کے بعد شاید ایک دن کے لئے بھی نہیں چھوٹی' یہاں تک کہ زندگی کا آخری کام جو وفات سے چند گھنٹے پہلے انجام دیا' وہ بھی ایک استفتاء کا جواب تھا' دوسری خدمات اپنے اپنے وقت کے ساتھ مخصوص رہیں اور ان کی انجام دہی میں وقفے آتے رہے' لیکن فتویٰ کا کام سفروحضر' صحت وعلالت' مصروفیت وفراغت' تنگدستی وخوشحالی کسی بھی حالت میں نہیں چھوٹا' آپ سفر میں جاتے تو ڈاک کا ایک ضخیم پیکٹ ساتھ ہوتا اور چلتی ہوئی ریل میں بھی' جب کہ عام آدمیوں کے لئے لکھنا ممکن نہیں ہوتا' ڈاک کا جواب برابر جاری رہتا تھا۔

ایک روز آپ نے فتویٰ کے ساتھ اس قدر شغف اور انہماک کا سبب خود بیان فرمایا جس سے اس طرز عمل کی حقیقت واضح ہوئی۔ فرمایا کہ دینی خدمت کے جتنے شعبے ہیں' ان میں سے فتویٰ وہ شعبہ ہے جس کا فائدہ نقد ظاہر ہو جاتا ہے' انسان تصنیف کرتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کتنے لوگ پڑھیں گے؟ اور جو لوگ پڑھیں گے وہ اس پر عمل کریں گے یا نہیں! اس طرح وعظ وتقریر کرنے والے کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے بیان سے کوئی متاثر ہو کر اس کی بتائی ہوئی بات پر عمل کرے گا یا نہیں! یہی حال تدریس کا ہے کہ طلبہ میں سے کتنے لوگ اس سے حقیقی فائدہ اٹھائیں گے؟ یہ معلوم نہیں ہوتا' اس کے برخلاف مفتی کے پاس عموماً وہی شخص سوال بھیجتا ہے جسے دین کی طلب ہوتی ہے اور جو مفتی کے فتوے کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے' اور عام طور سے اس پر عمل کر بھی لیتا ہے۔ اس لئے

اس کا فائدہ اگرچہ بظاہر محدود ہے، لیکن نقد اور متعین ہے، اس کے علاوہ اس خدمت میں شہرت طلبی وغیرہ کے مکائد نفس دوسری خدمت کے مقابلے میں کم ہیں، اس لئے اس میں اجروثواب کی امید زیادہ ہے۔

یوں تو فقہ وفتویٰ کے بارے میں حضرت والد صاحبؒ کا مزاج ومذاق اور اس شعبے میں آپ کی خدمت ایک وسیع موضوع ہے جس کا احاطہ نہ مجھ جیسے کم سواد اور نااہل کے لئے ممکن ہے اور نہ کسی مختصر مقالے میں اس کا حق ادا ہو سکتا ہے، لیکن چند موٹی موٹی باتیں جو اس وقت یاد آگئیں، انہیں بے ربط سے انداز میں پیش کردیا ہے اور فی الوقت اس سلسلے میں اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کو میرے اور پڑھنے والے حضرات کے لئے نافع ومفید بنائے۔ (آمین)

علم حدیث

علم حدیث وہ علم ہے جس کے بارے میں حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ اس سے میرا اشتغال بہت کم رہا۔ لیکن حضرتؒ کی یہ حسرت ان کے اپنے مقام کے اعتبار سے تھی، ورنہ اس علم میں بھی آپ سے ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں کہ ہم جیسے طالب علموں کو حیرت ہو جاتی تھی۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے علم حدیث حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے حاصل کیا جن کو اپنے زمانے کا حافظ ابن حجرؒ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے دورۂ حدیث بڑے ذوق وشوق اور اہتمام کے ساتھ پڑھا، اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر بخاریؒ اور تقریر ترمذیؒ درس کے دوران ہی عربی زبان میں قلمبند فرمائی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی حضرت والد صاحبؒ سے بڑی محبت تھی۔ اور درس کے دوران آپ سے خصوصی خطاب فرمایا کرتے تھے، والد صاحبؒ نے بارہا سنایا کہ ایک مرتبہ درس کے آغاز میں، میں نے کسی حدیث پر بحث کے دوران یہ سوال کیا کہ: "حضرت! یہ توثقہ کی زیادتی ہے، اس لئے مقبول ہونی چاہیے۔" حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر مفصل تقریر فرمائی اور بتایا کہ زیادۃ الثقۃ مقبولۃ کا قاعدہ اتنا عام نہیں ہے جتنا اسے سمجھا جاتا ہے، اور حافظ زیلعیؒ نے نصب الرایہ میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور

اس کے اصول بتائے ہیں۔ والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ احقر کو اطمینان ہو گیا لیکن اس کے بعد پورے سال یہ معمول رہا کہ جہاں کسی ثقہ کی زیادتی پر کوئی جرح ہوتی، حضرت شاہ صاحبؒ مجھے خطاب کر کے فرماتے : "کہاں گیا وہ ثقہ کی زیادتی والا؟"

حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر بخاری جو والد صاحبؒ نے ضبط فرمائی تھی وہ تو کسی "صاحب ذوق" کی بدمذاقی کی نذر ہو گئی۔ البتہ تقریر ترمذیؒ محفوظ رہی۔ بعد میں جب العرف الشذی اور الکوکب الدری چھپ کر آئیں تو حضرت والد صاحبؒ نے احقر کے عم محترم حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند سے اس کو صاف نقل کرایا، اور اس کے حواشی پر العرف الشذی اور الکوکب الدری کی زائد باتیں نقل کروادیں۔

اس طرح یہ ایک بڑا مفید مجموعہ ہو گیا ہے، اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ نے ایک مرتبہ اسے خصوصی فرمائش کر کے منگوایا، اور اس سے استفادہ فرمایا۔ احقر نے حضرت والد صاحبؒ سے اسے شائع کرنے کی درخواست کی تو فرمایا کہ اس پر نظرثانی کر کے یہ دیکھنا ہے کہ العرف الشذی، الکوکب الدری اور معارف السنن کے منظر عام پر آجانے کے بعد اس کی اشاعت مفید بھی ہوگی یا نہیں، لیکن پھر اس کی نوبت نہ آسکی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کافی عرصے تک حضرت والد صاحب قدس سرہ کو حدیث کی تدریس کی نوبت نہیں آئی اور پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کی تحریک پر آپ نے دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث شروع فرمایا جس کا واقعہ میں اپنے دوسرے مضمون حضرتؒ کے شیوخ و اکابر میں لکھ چکا ہوں۔ چنانچہ یہاں آپ نے شروع میں موطا امام مالکؒ موطا امام محمدؒ، سنن نسائیؒ اور طحاوی شریف کا درس دیا۔ اس زمانے میں ابوداؤد کا درس حضرت میاں صاحب مولانا سید اصغر حسین صاحب قدس سرہ کے سپرد تھا۔ ایک مرتبہ آپ علیل ہو گئے تو ان کی جگہ آپ نے ابوداؤد کا درس دیا۔ اس کے بعد کئی سال تک یہ سلسلہ رہا کہ ابوداؤد کا آغاز حضرت میاں صاحبؒ فرماتے اور ابتدائی چند ابواب کے بعد اس کی تکمیل حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ عملاً یہ درس بھی سالہا سال آپ کے پاس رہا۔

دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر

احمد صاحب عثمانی قدس سرہ (جو اس وقت ڈابھیل میں صحیح بخاری ؒ کا درس دیتے تھے) علیل ہوگئے تو آپ نے اپنی جگہ صحیح بخاری کی تدریس کے لئے حضرت والد صاحب ؒ کا انتخاب فرمایا' چنانچہ آپ ڈابھیل تشریف لے گئے اور حضرت علامہ عثمانیؒ کے قائم مقام کی حیثیت سے وہاں چند ماہ صحیح بخاریؒ کا درس دیا۔

پاکستان بننے کے بعد جب آپ نے دارالعلوم کراچی کی بنیاد ڈالی تو یہاں گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہر سال حدیث کا کوئی نہ کوئی سبق آپ نے اپنے پاس رکھا۔ دارالعلوم کے سب سے پہلے سال یہاں دورہ حدیث کا انتظام نہ تھا۔ اس سال مشکوٰۃ شریف آپ ہی نے پڑھائی اور اس کے بعد جب دورۂ حدیث کا آغاز ہوا تو اپنی ہمہ جہتی مصروفیات کے سبب بخاری شریف کی تدریس آپ کے لئے ممکن نہ تھی' اس لئے عموماً موطا امام مالکؒ آپ پڑھاتے رہے۔ لیکن جب دارالعلوم کورنگی میں منتقل ہوا اور آپ ملکی مصروفیات سے کنارہ کش ہوگئے تو پھر صحیح بخاریؒ کا درس کئی سال تک آپ کے پاس رہا۔

جس سال احقر اور برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم نے دورۂ حدیث کیا۔ اس سال آپ چونکہ شہر میں مقیم تھے۔ اس لئے موطا امام مالکؒ اور شمائل ترمذیؒ کا درس آپ نے اپنے ذمے لیا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں کتابیں ہمیں آپ ہی سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ کے درس کی چند خصوصیات یہ تھیں۔

(۱) چونکہ حدیث میں آپ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کے شاگرد رشید تھے' اس لئے درس حدیث میں تحقیقی مذاق آپ کو اپنے شیخ سے ورثے میں ملا تھا۔ لیکن آج کل ایسا بکثرت ہونے لگا ہے کہ تحقیقی مباحث کے پھیلاؤ میں حدیث کا متن' اس کے معانی ومطالب' اس کا اصل پیغام اور اس سے حاصل ہونے والے عملی فوائد پس پشت چلے جاتے ہیں اور استاذ وطالب علم کی تمام تر توجہ فقہی اختلافات' سند کی بحثوں اور رواۃ کی جرح وتعدیل پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ اس رجحان کے سخت خلاف تھے' اور فرمایا کرتے تھے کہ اس طرز عمل کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کچھ لوگ آم کے درخت کے نیچے جمع ہو کر آم کی تاریخ اس کی مختلف قسموں اور اس کے رنگ وبو پر بحث کرکے اٹھ جائیں اور انہیں عمر بھر آم کھانے کی توفیق نہ ہو۔ چنانچہ اس طرز عمل کا نتیجہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو حدیث کے متعلقہ مشہور فقہی اور اسنادی مباحث تو یاد ہو جاتے ہیں'

لیکن متن حدیث یاد نہیں ہوتا' اور بعض اوقات نہ اس کا صحیح ترجمہ کرنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے' اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے عملی مسائل میں اس حدیث سے کیا رہنمائی ملتی ہے؟ حالانکہ حدیث کو پڑھنے پڑھانے کا اصل مقصد یہی تھا' اور باقی تمام مباحث اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت والد صاحب قدس سرہ درس میں تحقیقی مباحث کے ساتھ ساتھ اس پہلو پر بھی پوری اہمیت کے ساتھ زور دیتے تھے۔

(۲) اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرتؒ کو فقہی مزاج عطا فرمایا تھا' اس لئے احادیث سے زندگی کے عام مسائل کے بارے میں جو ہدایات ملتی ہیں ان کے استنباط کا آپ کو خصوصی ذوق تھا' اور آپ کے درس میں بیٹھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جن احادیث کو ہم روزمرہ پڑھتے ہیں اور ان کو محض کسی مشہور فقہی مسئلے سے متعلق سمجھ کر گزر جاتے تھے' ان میں دوسری ضمنی ہدایات کا کیا جہاں پوشیدہ ہے؟ حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اور علامہ نوویؒ نے شرح مسلمؒ میں شرح حدیث کے اس پہلو کا بھی حق ادا کیا ہے' وہ جہاں حدیث کے مرکزی موضوع پر مفصل بحث کرتے ہیں وہاں ان سے حاصل ہونے والی دوسری ہدایات پر بھی "وفیہ ....وفیہ" کہہ کر متنبہ فرماتے جاتے ہیں۔

مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معروف حدیث صحاح میں موجود ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسمر مع ابی بکر فی امر من امور المسلمین وانا یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبرؓ سے عشاء کے بعد مسلمانوں کے کسی معاملے میں گفتگو فرمالیا کرتے تھے' اور میں بھی ان دونوں حضرات کے ساتھ ہوتا تھا' اس حدیث کا اصل موضوع یہ بتانا ہے کہ اگر کوئی دینی ضرورت درپیش ہو تو عشاءؔ کے بعد گفتگو کرنا جائز ہے' چنانچہ یہ حدیث عموماً "سمر بعد العشاءؔ" عشاءؔ کے بعد باتیں کرنے کے باب میں مذکور ہوتی ہے' اور یہی مسئلہ اس میں زیر بحث آتا ہے' لیکن اس مسئلے کی توضیح کے بعد حضرت والد صاحب قدس سرہ فرماتے کہ "یہاں یہ بات بطور خاص دیکھنے کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے یوں نہیں فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرماتے تھے' بلکہ یہ فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو فرماتے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ ادب سکھایا کہ جب کسی ایسے کام کا تذکرہ کرنا ہو جو تم نے اپنے کسی بڑے کے ساتھ مل کر کیا ہو تو یوں نہ کہو کہ یہ کام میں نے اور میرے فلاں

بزرگ نے مل کر انجام دیا' کیونکہ اس میں دونوں کی برابری کا شبہ ہوتا ہے' اس کے بجائے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ فلاں بزرگ نے یہ کام کیا اور میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ فرمایا کہ آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ذرا کسی کام سے کسی کا دامن چھو جائے تو اسے بلا شرکت غیرے اپنی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کا حال یہ تھا کہ کوئی کام واقعۃً خود کیا ہو تو بھی اسے اپنے بجائے اپنے کسی بڑے کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش فرماتے تھے۔

غرض اس طرح حضرت والد صاحب قدس سرہ کو احادیث سے اس قسم کے فوائد مستنبط فرمانے کا خاص ذوق تھا' اور یہ ان کے درس حدیث کی وہ خصوصیت تھی جو دوسری جگہ کم نظر آتی ہے۔ چنانچہ آپ کے درس حدیث سے جہاں تحقیقی معلومات کا ایک ذخیرہ طالب علم کو حاصل ہوتا تھا' وہاں تواضع' ایثار' خشیت و للّٰہیت اور دوسرے اسلامی اخلاق و آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ حاصل ہوتی رہتی تھی۔

(۳) آج کل اکثر و بیشتر مدارس میں درس حدیث کا یہ طریقہ عام ہوگیا ہے کہ حدیث کے جو ابواب مفصل فقہی اور اختلافی مباحث پر مشتمل ہوتے ہیں ان میں تو تقریر بڑے زور و شور سے ہوتی ہے' لیکن ان مخصوص ابواب کے بعد درس اتنی تیزی سے چلتا ہے کہ طلبہ حدیث کے مفہوم سے بھی بے خبر رہتے ہیں' چنانچہ فضائل و مناقب' آداب و اخلاق' سیر و مغازی فتن اور اشراط ساعۃ اور تفسیر جیسے ابواب عموماً اس طرح گزر جاتے ہیں کہ طالب علم استاذ کے سامنے احادیث کی ضروری تلاوت کرلیتا ہے' اور بس! حضرت والد صاحب قدس سرہ اس طرز عمل کے سخت مخالف تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ درس حدیث میں "روایۃً اور درایۃً " کی تفریق عہد حاضر کی بدعت ہے۔ اسلاف میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ بعض ابواب پر بحث کے دوران انتہا درجے کی تحقیق کا مظاہرہ کیا جائے اور بعض کو تشریح مفہوم کے قابل بھی نہ سمجھا جائے۔ اس کے بجائے درس شروع سال سے اس معتدل انداز پر ہونا چاہئے کہ تمام ابواب کے تحت ضروری معلومات طالب علم کے سامنے آجائیں اور درس حدیث کا اصل فائدہ حاصل ہو۔

(۴) حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ درس حدیث میں جو فقہی اختلافات اور ان کے مفصل دلائل بیان کئے جاتے ہیں' ان کا مقصد جہاں اپنے مسلک کے دلائل کی وضاحت

اور شبہات کا ازالہ ہوتا ہے' وہاں اصل مقصد طالب علم میں تحقیق و نظر کی صلاحیت پیدا کرنا ہے تاکہ اس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ حدیث سے مسائل واحکام کا استخراج متعارض احادیث میں تطبیق اور احادیث میں صحیح وسقم کی تحقیق کن اصولوں کے تحت کس طرح کی جاتی ہے؟ چنانچہ جب سال بھر تک اس قسم کے مباحث طالب علم کے سامنے آتے رہتے ہیں تو اس سے ایک مزاج پیدا ہو جاتا ہے جس کے ذریعے وہ آئندہ اپنی بساط کے مطابق تحقیقی کام کر سکتا ہے۔ لہٰذا ان مباحث کے دوران استاذ کو چاہئے کہ وہ یہ دیکھتا رہے کہ طالب علم میں یہ مزاج پیدا ہوا یا نہیں' استاذ کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو یاد رکھنا طالب علم کی کامیابی کے لئے ضروری نہیں۔ لیکن جن اصولوں کے تحت یہ مباحث ہوتے ہیں ان کا محفوظ ہو جانا ضروری ہے۔

(۵) اور چونکہ ان مباحث کا مقصد وہ ہے جو اوپر بیان ہوا' اس لئے ان مباحث میں جو مسائل آئمہ مجتہدین کے باہمی اختلافات سے متعلق ہیں' ان کو بیان کرتے وقت یہ انداز اختیار نہیں کرنا چاہئے جیسے حق وباطل کے درمیان معرکہ درپیش ہے۔ یہ اختلافات مکمل طور سے اخلاص اور علمی دیانتداری پر مبنی ہیں۔ اور ان کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطاء" اور دوسرے کے مسلک کو "خطا محتمل الصواب" قرار دیا جائے' لہٰذا ان مسائل پر گفتگو کے دوران فریق ثانی کے احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھنا لازمی ہے اور اس سلسلے میں مناظرانہ انداز سے مکمل اجتناب کرنا چاہئے۔ جو حضرات جوش تقریر میں امام بخاریؒ' امام دار قطنیؒ' امام بیہقیؒ یا حافظ ابن حجرؒ کی تردید کرتے ہوئے ان کے بارے میں ایسے کلمات کہہ دیتے ہیں جو ان حضرات کے شایان شان نہیں ہوتے' حضرت والد صاحبؒ ان پر سخت نکیر فرمایا کرتے تھے' اور اپنے استاذ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کرتے تھے کہ : "حافظ ابن حجرؒ ہوں یا علامہ عینیؒ' یہ سب حضرات صدیوں پہلے جنت میں اپنے خیمے گاڑ چکے ہیں' ان کی شان میں کوئی نامناسب بات کہہ کر اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔"

(۶) اسی طرح حضرت والد صاحب قدس سرہ اس طرز عمل کے بھی سخت مخالف تھے کہ کسی خاص مسلک کا دفاع کرتے ہوئے کسی حدیث کو زبردستی کھینچ تان کر اس مسلک پر فٹ کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے دور از کار تاویلات کا راستہ اختیار کیا جائے۔

اس کے بجائے آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ اگر قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں حدیث کی کوئی بے تکلف توجیہ ہو سکتی ہو تو اسے اختیار کیا جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو واضح طور پر یہ اعتراف کرلیا جائے کہ اس سے فلاں مجتہد کا مسلک ثابت ہوتا ہے' البتہ اس کے مقابلے میں اپنے امام کی دلیل اور ان کے قول کا ماخذ بھی بیان کردیا جائے' اور اس کی جو بے تکلف وجوہ ترجیح موجود ہوں انہیں واضح کردیا جائے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ آئمہ مجتہدین کا اختلاف تو ہوا ہی اس مقام پر ہے جہاں دلائل کی رو سے دونوں راہوں کی گنجائش موجود تھی' لہٰذا یہ ثابت کرنے کی فکر کہ دوسرا مسلک بلا دلیل ہے' بڑی نادانی کی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دلائل دونوں طرف موجود ہیں' اور کسی ایک مجتہد کی تقلید تو کی ہی اس مقام پر جاتی ہے جہاں دلائل متعارض ہوں' اس لئے اگر کسی حدیث کے بارے میں یہ مان لیا جائے یہ شافعیہؒ یا حنابلہؒ یا مالکیہؒ کے مسلک پر دلالت کرتی ہے تو یہ واقع کے عین مطابق ہوگا' کیونکہ اگر اس مسلک پر کوئی دلیل نہ ہوتی تو یہ حضرات اسے اختیار ہی کیوں فرماتے۔

اسی ضمن میں حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے ۴۵ھ میں جو پہلا حج کیا تو وہاں حرم مکہ میں حدیث کے مختلف درس ہوا کرتے تھے' ان میں شرکت کی تو ان کا طریقہ بہت پسند آیا کہ وہ حدیث میں تاویلات کرنے کے بجائے ایک ہی باب کی مختلف احادیث آئیں تو ایک حدیث کے تحت فرماتے فیہ حجۃ سادا تنا المالکیۃ پھر اس کے مخالف دوسری حدیث آتی ہو تو فرماتے : فیہ حجۃ ساداتنا الحنفیۃ

علم حدیث سے متعلق تصانیف

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' خود حضرت والد صاحبؒ کے بقول' علم حدیث آپ کا خصوصی موضوع نہیں رہا' لیکن ضرورت کے مطابق اس علم میں بھی آپ کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔

ان میں سے ایک نمایاں کتاب تو "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" ہے جو عقیدہ نزول مسیح سے متعلق احادیث کا جامع ترین ذخیرہ ہے۔ اس کتاب کا ابتدائی مواد حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ نے جمع فرمایا تھا' پھر اس کی تالیف

و ترتیب حضرت والد صاحبؒ کے سپرد فرمادی۔ چنانچہ جب آپ نے اسے مرتب فرما کر حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے بہت دعائیں دیں اور حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا : "دیکھو بھائی ' محنت تو ہم کرتے ہیں ' اور ثواب یہ صاحب لے اڑتا ہے۔" اس کتاب کا مفصل تعارف حضرت مولانا محمد اشرف صاحب مدظلہم نے اپنے مقالے "حکیم الامتؒ کے علمی جانشین" میں کرادیا ہے

اس کتاب کا اردو ترجمہ مع تحقیق و تشریح برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم نے کیا ہے جو "علامت قیامت اور نزول مسیح" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

دوسری کتاب "الازدیاد السنی علی الیانع الجنی" ہے۔ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کی اسانید کتب حدیث کے مؤلفین تک "الیانع الجنی" میں موجود ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ نے اس رسالے میں تمام اکابر علمائے دیوبند کی اسانید حدیث حضرت شاہ عبدالغنی صاحب قدس سرہ تک جمع فرمائی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب تمام بزرگان دیوبند کا ثبت ہے جس میں ان حضرات کے مختصر حالات بھی موجود ہیں۔

تیسری کتاب "ختم النبوۃ فی الحدیث" ہے جو ختم نبوت پر دلالت کرنے والی احادیث کا جامع ترین ذخیرہ ہے ' اور اب "ختم نبوت کامل" کا ایک جزء ہے۔

چوتھا رسالہ "جوامع الکلم" ہے جو درحقیقت اخلاق و آداب سے متعلق ایک چہل حدیث ہے اور "سیرت خاتم الانبیاؑ" کے آخر میں شائع ہو گیا ہے۔

پانچواں رسالہ "آداب النبیؐ" ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل واخلاق جمع فرمائے گئے ہیں۔

چھٹا رسالہ "الماموں المقبول فی ظل الرسولؐ" ہے جو "سایہ رسولؐ" کے نام سے طبع ہوا ہے اور اس میں خصائص کبریٰ کی اس روایت کی مکمل تحقیق ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں پڑتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک چہل حدیث حرمت سود سے متعلق مسئلہ سود میں شائع ہوئی ہے۔ ایک حرمت غناء سے متعلق احکام القرآن میں شامل ہے ' اور ایک معاشی مسائل سے متعلق چہل حدیث غیر مطبوعہ ہے۔ نیز بعض دوسرے چھوٹے چھوٹے رسائل بھی ایسے ہیں جنہیں علم حدیث سے متعلق کہا جاسکتا ہے۔

علم تفسیر

عمر کے آخری سالوں میں حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ابتداء میں علم تفسیر کے ساتھ کوئی خصوصی شغف نہیں رہا' لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اب سب سے زیادہ دلچسپی مناسبت اور شغف علم تفسیر کے ساتھ معلوم ہوتا ہے' اور دعا ہے کہ اسی پر میرا خاتمہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور جس علم کے ساتھ آپ کو سب سے زیادہ دلچسپی آخروقت تک قائم رہی' وہ علم تفسیر ہی تھا۔

یوں تو دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے علاوہ آپ کو تفسیر جلالین اور بیضاوی پڑھانے کی نوبت آئی' اور ایک عرصے تک دورہ تفسیر کے بعض اسباق تفسیر ابن کثیر وغیرہ بھی آپ کے ذمے رہے۔ لیکن اس زمانے میں خصوصی شغف علم فقہ اور فتویٰ کے ساتھ تھا۔ پھر جب دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے "احکام القرآن" کا کام آپ کے سپرد فرمایا تو اس زمانے میں تفسیر سے خصوصی اشتغال کی نوبت آئی' پھر ہجرت پاکستان کے بعد بھی مسجد باب الاسلام کراچی میں روزانہ اور ریڈیو پر ہفتہ وار درس قرآن کا سلسلہ رہا' جو بالآخر "معارف القرآن" جیسی عظیم تفسیر کی شکل میں منظرعام پر آیا۔ اس پورے زمانے میں قرآن کریم ہی آپ کی دلچسپیوں اور غور وتدبر کا محور رہا۔

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو تلاوت قرآن کا خاص ذوق تھا۔ خاص طور پر عمر کے آخری پندرہ بیس سالوں میں آپ گوناگوں مصروفیات کے باوجود بڑے اہتمام کے ساتھ کئی کئی پارے روزانہ تلاوت کے لئے وقت نکالتے تھے' ایک چھوٹی سی حمائل ہمیشہ آپ کے دستی بیگ میں ساتھ رہتی تھی' اور جب کبھی ذرا موقع ملتا' آپ اس میں سے تلاوت شروع فرمادیتے' خاص طور سے جب آپ کو کہیں جانا ہوتا تو کار میں سفر کے دوران بیشتر وقت آپ تلاوت میں صرف فرماتے' اس کے علاوہ گھر میں نماز فجر اور نماز عصر کے بعد آپ کی تلاوت کے خاص اوقات تھے۔

آپ کی یہ تلاوت محض برائے تلاوت ہی نہیں ہوتی تھی' بلکہ اس دوران آپ قرآن کریم میں تدبّر فرماتے تھے' احقر نے بارہا دیکھا کہ تلاوت کے دوران آپ اچانک رک گئے ہیں' اور دیر تک ایک ہی آیت کو بار بار پڑھ کر اس پر غور فرما رہے ہیں۔ اس تدبّر کے دوران

اللہ تعالیٰ آپ پر قرآن کریم کے حقائق و معارف سے متعلق عجیب و غریب نکات منکشف فرماتے تھے۔ جب کبھی تلاوت کے وقت ہم لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوتے تو اکثر یہ نووارد نکات ہمیں بھی بتلا دیا کرتے تھے' اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ تلاوت کرتے ہوئے آپ احقر کو یا برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم کو باقاعدہ متوجہ فرماتے' اور ہم سے سوال کرتے کہ دیکھو' اس آیت میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ بات دوسرے لفظ سے بھی واضح ہو سکتی تھی' خاص طور پر اس لفظ کے انتخاب میں کیا حکمت ہے۔ اور جب ہم عام طور سے جواب نہ دے پاتے تو پھر خود ہی کوئی لطیف نکتہ بیان فرماتے جس سے مشام روح معطر ہو جاتا۔

جہاں تک حضرت والد صاحبؒ کی تفسیری خدمات کا تعلق ہے' ان کا مفصل تذکرہ اسی نمبر میں حضرت مولانا عبدالشکور ترمذی' حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحب اور مولانا حسین احمد نجیب کے مضامین میں آگیا ہے۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں۔ البتہ متفرق اوقات میں آپ سے جو تفسیری فوائد سنے ان میں سے چند ذکر کرنے کو دل چاہتا ہے۔

چند اہم تفسیری نکات

فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت ہے کہ :

وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (البقرہ ۱۰۲)

اور بلاشبہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ جو لوگ یہ (جادو) مول لیں گے ان کو آخرت میں کچھ نہ ملے گا اور جس چیز کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچا ہے وہ بہت بری ہے۔ کاش وہ جانتے!

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کے لئے بیک وقت علم کا اثبات بھی فرمایا ہے' اور نفی بھی فرمائی ہے۔ یعنی پہلے تو یہ فرمایا کہ "انہیں اس بات کا علم ہے" اور پھر آخر میں فرمایا کہ "کاش وہ جانتے" جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہیں جانتے۔ بظاہر تو آیت کے اول و آخر میں تضاد محسوس ہوتا ہے' لیکن درحقیقت اشارہ اس طرف فرمایا گیا ہے کہ لغوی مفہوم کے لحاظ سے تو انہیں علم حاصل ہے' مگر علم کی حقیقت حاصل نہیں' کیونکہ اگر حقیقت علم

حاصل ہوتی تو علم کے تقاضے پر عمل بھی کرتے، معلوم ہوا کہ حقیقی علم وہی ہے جس پر عمل کیا جائے اور جس علم کے تقاضوں پر عمل نہ ہو وہ کالعدم ہے، اور اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسی ضمن میں حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ لغوی اعتبار سے تو موجودہ مخلوقات میں سب سے بڑا عالم شیطان ہے، لہٰذا اگر محض کسی بات کا جاننا انسان کی فضیلت کے لئے کافی ہوتا تو شیطان سب سے افضل ہوتا، لیکن کوئی ادنیٰ فہم رکھنے والا شخص بھی اسے افضل قرار نہیں دے سکتا۔ معلوم ہوا کہ فضیلت کی چیز صرف وہ علم ہے جس پر انسان عمل پیرا بھی ہو، ورنہ وہ وبال ہے۔

(۲) فرمایا کہ سورۂ فاتحہ کو قرآن کریم کا خلاصہ کہا گیا ہے، اور علماء نے فرمایا ہے کہ سورۂ فاتحہ کا خلاصہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ میں ہے، ادھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے "الصراط المستقیم" کی تشریح سورۂ فاتحہ کی دو آیتوں میں فرمائی ہے۔ صراط مستقیم کی تشریح اس طرح بھی کی جا سکتی تھی کہ وہ قرآن کریم کا بتایا ہوا راستہ ہے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہاں صراط القرآن کہنے کے بجائے ارشاد فرمایا :

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ

راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے اپنا انعام فرمایا، نہ کہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب نازل ہوا اور نہ گمراہوں کا۔

اسلوب بیان سے اس طرف اشارہ ہے کہ "صراط مستقیم" محض کتابوں کے پڑھنے پڑھانے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لئے ایسے حضرات سے عملی ہدایات لینے کی ضرورت ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام نازل فرمایا، اور ایسے حضرات کی تفصیل قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان فرمائی ہے :

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النساء : ۶۹)

یہ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے دو سلسلے قائم فرمائے ہیں۔ ایک کتاب اللہ کا سلسلہ، دوسرا رجال اللہ کا، اور

ہدایت ان دونوں سلسلوں سے وابستہ رہ کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ سلف صالحین کی اتباع کے بغیر صرف کتابوں کے ذریعے ہدایت کے طلب گار ہوں وہ قرآن کریم کے بیان فرمائے ہوئے طریقے سے روگردانی کرتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ کی مذکورہ آیت کے علاوہ کئی دوسری آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے حصول کے لئے صلحاء واولیاء کی صحبت واتباع کا حکم دیا ہے' چنانچہ ارشاد ہے :

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ

اور پیروی کرو ان لوگوں کی جو میری طرف رجوع کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ

اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو' اور صادقین کے ساتھی بن جاؤ۔

اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ تقویٰ محض نظریاتی طور پر کچھ باتیں معلوم کر لینے سے نہیں' بلکہ "صادقین" کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے' اور "صادقین" کون لوگ ہیں؟ اس کا جواب ایک دوسری آیت میں ہے کہ :

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کے بہت سے شعبے بیان فرمائے ہیں' اور ان کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے : ۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

یہی لوگ ہیں جنہوں نے صدق اختیار کیا' اور یہی لوگ متقی ہیں۔

(۴) فرمایا کہ قرآن کریم نے حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت اور آپؐ کے فرائض منصبی اس طرح بیان فرمائے ہیں :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران' ۱۶۴)

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تلاوت آیات کو ایک مستقل فریضہ قرار دیا ہے' اور تعلیم کتاب کو علیحدہ ذکر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن کریم کے معانی و مطالب کی تشریح ضروری ہے' اسی طرح الفاظ قرآن کی تلاوت مستقل مقصد ہے۔ اس سے ان لوگوں کی تردید ہو جاتی ہے جو قرآن کریم کی تلاوت کو (معاذ اللہ) بیکار قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے "تعلیم کتاب و حکمت" کو الگ ذکر فرمایا ہے اور "تزکیہ" کو علیحدہ اس سے معلوم ہوا کہ محض نظریاتی طور پر تعلیم دے دینے سے اصلاح نہیں ہوا کرتی' بلکہ اس تعلیم کے مطابق عمل کرانے کے لئے جداگانہ تربیت کی ضرورت ہے اور اس کا ذریعہ صحبت ہے۔ اس سے ان لوگوں کی تردید ہو گئی جو صرف کتابیں پڑھ لینے کو اصلاح کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے تعلقات کو اپنی آیات قدرت میں شمار کرکے ارشاد فرمایا ہے کہ :

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً

اور اللہ نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا فرمائی۔

حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں دو لفظ استعمال فرمائے' ایک مودت' اور ایک رحمت اور خیال یہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ جوانی میں باہم محبت و مودّت کا غلبہ ہوتا ہے' اور بڑھاپے میں یہ محبت رحمت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

(٦) قرآن کریم کی آیت ہے :

إِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ

بلاشبہ دنیوی زندگی کھیل کود ہے' اور زینت ہے' اور باہم مفاخرت کا جذبہ ہے اور مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے سے مقابلہ ہے۔

حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انسانی زندگی کے مختلف ادوار کی امتیازی خصوصیات بیان فرما دی ہیں' کیونکہ بچپن کا زمانہ کھیل کود کا دور ہے۔ پھر جوانی میں انسان کی زیادہ تر دلچسپیاں زینت و آرائش سے متعلق ہوتی ہیں اور جسم و لباس کی زینت سے لے کر مکان تک کی زینت اس کی سوچ کا محور بن جاتی ہے' پھر ادھیڑ عمر میں مفاخرت کا دور آتا ہے اور آخر میں ساری دلچسپیاں اس پر صرف ہو جاتی ہیں کہ میں مال و اولاد کے اعتبار سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نظر آؤں۔ اس طرح یہ آیت بچپن سے بڑھاپے تک کی پوری داستان ہے۔

(۷) فرمایا کہ حضرت میاں صاحب (حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ نے ایک

دن ہم سے فرمایا کہ قرآن کریم میں ریل گاڑی کا ذکر آیا ہے۔ ہم حیران ہوئے تو فرمایا کہ وہ ذکر اس آیت میں ہے:۔

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ

اور اللہ نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سواری کرو، اور وہ تمہارے لئے باعث زینت ہوں، اور اللہ ایسی چیزیں پیدا فرمائے گا جنہیں تم نہیں جانتے۔

فرمایا کہ اس آیت میں ان تمام سواریوں کا ذکر آگیا ہے جو قیامت تک ایجاد ہوں گی۔

(۸) ایک دن حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اجمالی طور پر تمام سواریوں کا ذکر تو مذکورہ بالا آیت میں ہے، لیکن ایک آیت میں خاص طور پر ہوائی جہاز کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے سورہ یٰس میں ارشاد ہے :۔

وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ

اور ان کے لئے ایک نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی ذرّیت کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ہم نے ان کے لئے اس کشتی جیسی ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وہ سواری کریں۔

اس آیت کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ "کشتی جیسی ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وہ آئندہ سواری کریں گے۔" والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کا مصداق ہوائی جہاز ہو سکتا ہے، کیونکہ ایسی سواری جو کشتی نہ ہو لیکن کشتی جیسی ہو، ہوائی جہاز ہو سکتی ہے۔

(۹) فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ

اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے ہیں۔

اس میں صرف حیوانات اور نباتات نہیں، بلکہ ہر چیز کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کے جوڑے پیدا کئے گئے ہیں۔ آج سائنس کی تحقیق بھی یہی ہے اور بجلی کے دو عنصر مثبت (Positive) اور منفی (Negative) بھی اس زوجین کا مصداق بن سکتے ہیں۔

(۱۰) فرمایا کہ حرم شریف کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يُجْبٰى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ
اس کی طرف ہر چیز کے ثمرات پہنچائے جاتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف "ثمرات" یا "ثمرات کل شجر" کہنے کے بجائے "ثمرات کل شئی" فرمایا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں صرف درختوں کے نہیں بلکہ ہر چیز کے پھل پہنچتے ہیں، اور اس عموم میں فیکٹریوں کی مصنوعات بھی شامل ہو جاتی ہیں جن کی آج حرم شریف میں ریل پیل نظر آتی ہے۔

(۱۱) قرآن کریم کی آیت :۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ

تو کیوں نہ نکل پڑی ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرے اور اپنی قوم کے پاس واپس جاکر انہیں ڈرائے۔

اس آیت کی تفسیر پر حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے دارالعلوم میں ایک مفصل خطاب فرمایا تھا جو کئی روز میں مکمل ہوا، اس خطاب میں آپ نے آیت کے مختلف پہلوؤں پر بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی، اور اس ذیل میں عجیب و غریب تفسیری نکات بیان فرمائے۔ اس خطاب کے اہم نکات "معارف القرآن" میں مذکورہ آیت کے تحت شامل ہو گئے ہیں۔ ان میں سے چند مختصراً تیں درج ذیل ہیں :

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ "نفر" استعمال فرمایا ہے۔ حالانکہ مفہوم لفظ "خرج" سے بھی ادا ہو سکتا تھا۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ "نفرمنہ الیہ" کے معنی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک شخص کسی چیز سے نفرت یا اعراض کر کے دوسری چیز کی طرف مکمل یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو۔ لہٰذا اس لفظ سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ علم کی تحصیل صحیح طور پر اسی وقت ممکن ہے جب انسان ہر دوسری مصروفیت سے یکسو ہو کر پورے انہماک کے ساتھ علم کی تحصیل میں مشغول ہو جائے۔

اسی طرح آیت میں تحصیل علم کے لئے "لیتعلموا الدین" کے بجائے اللہ تعالیٰ نے "لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اس میں پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ عربی زبان

میں باب تفعل کی ایک خاصیت تکلف بھی ہے جس میں محنت و مشقت کا مفہوم بھی شامل ہے' اور اس سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ تحصیل علم کے لئے محنت و مشقت کی ضرورت ہے' اور دوسرے اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ علم دین کی تحصیل میں مقصد محض علم برائے علم نہیں ہونا چاہیے' بلکہ اس کا مقصد دین کی صحیح فہم اور سمجھ پیدا کرنا ہونا چاہئے۔ لہذا صرف کتابیں پڑھنے یا اصطلاحات یاد کرلینے سے علم دین کا مقصد پورا نہیں ہوتا' بلکہ ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے دین کا صحیح مزاج و مذاق اور اس کی سمجھ پیدا ہو۔ جس میں صحبت و تربیت بھی داخل ہے۔

آگے علم دین کی تحصیل کا مقصد دعوت و تبلیغ کو قرار دیا گیا ہے' اور اس کے لئے قرآن کریم نے لفظ "انذار" استعمال فرمایا ہے۔ "انذار" کے لغوی معنی ہیں ڈرانا' لیکن یہ لفظ "تخویف" کے ہم معنی نہیں ہے' بلکہ "انذار" صرف اس ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا محرک مخاطب پر شفقت ہو قرآن کریم نے بیشتر مقامات پر تبلیغ و دعوت کے لئے یہی لفظ اختیار فرمایا ہے جس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ تبلیغ و دعوت مخاطب کی ہمدردی' دلسوزی اور شفقت کے جذبات کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اور جس تبلیغ میں ان جذبات کے بجائے مخاطب پر غصہ' اس سے نفرت یا اس کی تحقیر کے جذبات شامل ہوں وہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب نہیں ہے۔

(۱۲) فرمایا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنی والدین سے دوبارہ ملاقات ہوئی ہے اس وقت انہوں نے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں وہ بڑے سبق آموز ہیں۔ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو مل کر اپنا دکھڑا روتا کہ جدائی کے بعد کیا کیا مصائب مجھ پر پیش آئے کتنے سالوں قید خانے میں رہا اور کتنی مدت تکلیفیں اٹھائیں' لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد ماجد کو دیکھتے ہی جو بات ارشاد فرمائی وہ یہ تھی :

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْ اَبَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ۔

"اور بلاشبہ اللہ نے مجھ پر احسان فرمایا کہ مجھے قید خانے سے نکالا' اور آپ کو دیہات سے لے آیا' بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان وسوسے ڈال دیئے تھے"۔

یہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے مصائب و آلام کا ذکر فرمانے کے بجائے گفتگو کا آغاز ہی اللہ تعالیٰ کے شکر سے فرمایا' اور قید خانے میں جانے اور وہاں مصائب برداشت کرنے کا ذکر نہیں فرمایا' بلکہ وہاں سے نکلنے کا ذکر فرمایا' اسی طرح والدین کی جدائی کا شکوہ کرنے کے بجائے دوبارہ مل جانے پر شکر ادا کیا' اور بھائیوں سے جو غلطی سرزد ہوئی تھی' اس پر اپنے جذبات کے اظہار کے بجائے اسے شیطان کے سر ڈال دیا۔

فرمایا کہ درحقیقت شکر گزار بندوں کا شیوہ یہی ہے کہ وہ تکلیفوں کا شکوہ کرنے کے بجائے ان سینکڑوں انعامات خداوندی پر نظر رکھتے ہیں جو عین تکالیف کے دوران یا ان کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر مبذول رہتے ہیں۔ اور اگر انسان ان انعامات کا استحضار پیدا کرلے تو اسے دنیا کی کوئی تکلیف ناقابل برداشت محسوس نہ ہو' بلکہ تکلیف بھی راحت نظر آنے لگے۔

(۱۳) فرمایا کہ جس وقت زلیخا نے دروازوں کو مقفل کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت گناہ دی' اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو معلوم تھا کہ دروازے مقفل ہیں اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے' لیکن اس کے باوجود آپ دروازے کی طرف دوڑے' اس سے معلوم ہوا کہ جتنی کوشش انسان کے بس میں ہو اس سے دریغ نہ کرنا چاہئے' خواہ آگے راستہ بند نظر آتا ہو' کیونکہ بعض اوقات وہ تھوڑی سی کوشش جو بظاہر بے فائدہ نظر آرہی تھی' اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے راستہ کھول دیتے ہیں' چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے دروازہ کھلنے کا سامان پیدا فرما دیا' اسی کو حضرت مولانا رومیؒ نے ارشاد فرمایا ہے۔

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید
خیرہ یوسفؑ وار می باید دوید

(۱۴) قرآن کریم کا ارشاد ہے : ۔

اور دو ان کو اللہ کے اس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے فلسفہ ملکیت کی طرف واضح اشارہ فرما دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیوی مال و دولت پر اصلی اور حقیقی ملکیت تو اللہ تعالیٰ کی ہے' اسی لئے اس کو "مال اللہ" سے تعبیر فرمایا ہے' البتہ اللہ تعالیٰ نے

وہ مال تمہیں عطا فرما دیا ہے' لہٰذا عطاء خداوندی سے اس پر تمہیں بھی حقوق ملکیت حاصل ہوگئے ہیں' لیکن چونکہ اصل ملکیت اللہ کی ہے اس لئے وہ جس جگہ مال خرچ کرنے کا حکم دے دے اس کا حق ہے اور تم پر اس کی تعمیل واجب ہے۔ انسان کو مال خرچ کرنے میں رکاوٹ اسی بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ وہ اس پر اپنی حقیقی ملکیت سمجھتا ہے۔ چنانچہ شعیب علیہ السلام کی قوم نے ان سے یہی کہا تھا کہ :۔

کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کی عبادت چھوڑ دیں' یا یہ کہ اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق کام نہ کریں؟

قرآن کریم نے اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مقابلے میں اس ذہن کی تعمیر کی ہے جو ہر قسم کے مال و دولت کو اللہ کی ملکیت قرار دے' اور اس ذہن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسے اللہ کے حکم کے مطابق دوسروں پر خرچ کرنے سے کبھی انکار ممکن نہیں ہوتا۔

یہ حضرت والد صاحبؒ کی تفسیری استنباطات کی چند مثالیں تھیں' اس قسم کے تفسیری فوائد حضرت والد صاحبؒ قدس سرہ' کی حیات میں وقتاً فوقتاً فردوس گوش ہوتے رہتے تھے' اور اگر میں آپ سے سنے ہوئے ان تفسیری فوائد کو جمع کروں تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے' لیکن یہاں اس سلسلے کو دراز کرنے کی ضرورت اس لئے معلوم نہیں ہوتی کہ اس قسم کے بیشتر فوائد "معارف القرآن" میں آچکے ہیں' یہاں تو آپ کے تدبّر و فہم قرآن کی ایک جھلک دکھانی مقصود تھی' اس لئے ان چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ان چند مثالوں ہی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم اور اس کے حقائق و معارف سے آپ کو کسی قدر گہری مناسبت تھی' آپ ہم خدّام سے بھی فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کی محض تلاوت بھی بلاشبہ بہت موجب اجر ہے لیکن ایک عالم کو چاہیے کہ وہ کچھ وقت تدبّر قرآن کے لئے بھی نکالا کرے۔ قرآن کریم کا کوئی لفظ حشو یا زائد نہیں ہے' لہٰذا اگر غور کیا جائے تو اس کے ہر لفظ سے کسی نئے فائدے کی طرف رہنمائی مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو قاضی ابوالسعود کی تفسیر اور علامہ قرطبیؒ کی احکام القرآن خاص طور پر بہت پسند تھیں' کہ ان میں قرآن کریم کی بلاغت کے نکات اور اس سے مستنبط ہونے والے فوائد بکثرت ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ ابوحیان اندلسیؒ کی تفسیر "البحر المحیط" کے بارے میں آپ فرماتے تھے کہ اس میں نحوی ترکیبوں اور اختلاف قراآت پر جو بحثیں ہوتی ہیں ان سے بھی

اس قسم کے نادر نکات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

عملی مذاق

اب تک جو باتیں بیان ہوئیں وہ حضرت والد صاحبؒ کے علمی مذاق سے متعلق تھیں، آپ کے مزاج و مذاق کا دوسرا حصہ آپ کی عملی زندگی سے متعلق ہے، یہ حصہ اور زیادہ لطیف اور نازک ہے اور اس کو الفاظ میں منتقل کرنا پہلے حصے سے زیادہ مشکل ہے، تاہم جو باتیں احقر کے فہم و ادراک میں آسکیں انہیں اپنی بساط کی حد تک بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں، واللہ الموفق والمعین۔

حضرت والد صاحبؒ کی عملی زندگی کو عبادت[۱]، دعوت[۲] و تبلیغ، سیاست[۳] اور معاشرت[۴] و معاملات کے مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسی ترتیب سے چند باتیں پیش خدمت ہیں۔

عبادات

(۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحبؒ قدس سرہ کو عبادت کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا اور عبادت کے ہر شعبے میں قابل صد رشک نقوش چھوڑنے کے باوجود ہم نے ہمیشہ آپ کو اس بات پر حسرت ہی کا اظہار کرتے پایا کہ مجھ سے عبادت نہیں بن پڑتی۔ اگرچہ آپ کی ساری زندگی ایسی ہنگامی اور تلاطم خیز تھی کہ صبح سے شام تک کے تمام اوقات مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے تھے، سیاست، انتظامی بکھیڑے، وعظ و تقریر، تدریس اور فتویٰ، تصنیف و تالیف، خدمت خلق، غرض دینی خدمات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا، جس میں آپ کا مؤثر حصہ نہ ہو اور ان میں سے ہر شعبہ شب و روز کے تمام اوقات اسی پر وقف کر دینے کا متقاضی تھا، آپ فجر کے بعد سے جو کام میں لگتے تو رات کے بارہ بارہ بلکہ ایک ایک بجے تک انتھک مصروف رہتے تھے، عصر کے بعد جب دوسرے لوگ ذہنی سکون کی خاطر کسی تفریح میں لگتے یا گھر ہی میں فراغت کے ساتھ بیٹھتے تو آپ کا قلم اس وقت بھی چلتا رہتا، کبھی ڈاک لکھی جا رہی ہے، کبھی فتووں کا جواب دیا جا رہا ہے، کبھی امانتوں کا حساب و کتاب درپیش ہے، غرض جب آپ سونے کے لئے لیٹتے تو جسم تھکن سے چور اور ذہن منتشر افکار کی آماجگاہ ہوتا تھا۔ اس لئے

اس ذہنی انتشار کی حالت میں یکسوئی کے ساتھ عبادت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس کے باوجود تہجد، اشراق، چاشت، صلاۃ الاوابین، تلاوت قرآن، مناجات مقبول اور کم از کم ایک گھنٹے کے اوراد و ظائف کا معمول التزاماً پورا فرمایا کرتے تھے۔ دیوبند کے مکان میں ایک چھوٹا سا کمرہ حضرت والد صاحبؒ نے عبادت ہی کے لئے مختص فرمایا ہوا تھا۔ جسے سب اہل خانہ حجرہ کہتے تھے اور آخر شب میں وہاں تہجد کے بعد دیر تک ذکر کا معمول تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی اشغال نسبتہً کم ہوتے تو ان معمولات میں اضافہ ہو جاتا اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ذکر اس کے علاوہ تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہمیشہ آپ کو اپنی عبادت کی کمی پر حسرت ہی کرتے دیکھا، حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کے نام آپ جو مکاتیب اپنے حالات کے سلسلے میں تحریر فرماتے، ان میں بھی بار بار اس حسرت کا اظہار ہے کہ مجھے دوسرے مشاغل کی بنا پر اکثار ذکر و عبادت کا موقع نہیں ملتا، یہاں تک کہ حضرت حکیم الامت رحمتہ اللہ نے ایک اسی قسم کے مکتوب کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"اکثار ذکر سے جو مقصود ہے وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کو تقلیل میں بھی حاصل ہے۔"

(مکتوب نمبر ۶۶ مورخہ ۲۸ رمضان ۴۸ھ)

اللہ اکبر! حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے آپ کو یہ کتنی بڑی سند عطا فرما دی تھی، کوئی ہم جیسا کم ظرف ہوتا تو اتنے بڑے باریک بیں شیخ سے یہ سند پانے کے بعد اس جانب سے بے فکر ہو بیٹھتا، لیکن آپ کی یہ فکر آخر دم تک زائل نہیں ہوئی۔ عمر کے آخری حصے میں جب ضعف انتہا کو پہنچ چکا تھا اور بینائی جواب دے گئی تھی تو دوسرے مشاغل سے یکسو ہو کر ذکر میں مشغول رہنے کی آرزو اللہ تعالیٰ نے پوری فرما دی تھی۔ چنانچہ ان دنوں آپ کا بیشتر وقت ذکر اللہ ہی میں صرف ہوتا تھا، لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک روز حضرت والد صاحبؒ نے اپنے معالج ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب سے فرمایا۔

"ڈاکٹر صاحب! اس ضعیفی کی بنا پر دوسرے مشاغل سے تو بیکار ہو ہی گیا تھا، البتہ ذکر و تسبیح کا موقع مل جاتا تھا، مگر کچھ روز سے ضعف ایسا ہے کہ زبان کی حرکت سے بھی ضعف بڑھ جاتا ہے، اس کا بڑا افسوس ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا : ۔ ”حضرت! آپ کو زبان کی حرکت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ قلب سے ذکر فرمالیا کریں“

اس پر حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا : ۔

”بحمد اللہ اس کی تو توفیق ہو جاتی ہے، مگر ذکر لسانی کو بھی تو دل چاہتا ہے۔“

اندازہ فرمایئے کہ جس شخص کی ساری عمر خدمت دین کے عظیم کارناموں میں صرف ہوئی ہو، جسے اس کا شیخ کامل۔ اور حضرت تھانویؒ جیسا شیخ کامل۔ یہ شہادت دے چکا ہو کہ آپ کو ذکر قلیل سے بھی وہی مقصود حاصل ہے جو دوسروں کو ذکرِ کثیر سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کو ضعف و نقاہت کے اس عالم میں بھی قلت ذکر کی تشویش اور اس کی حسرت لگی ہوئی ہے۔

(۲) نماز سے حضرت والد صاحبؒ قدس سرہ کو خاص شغف تھا، اور جن لوگوں نے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے انہیں یاد ہوگا کہ نماز کے دوران آپ پر عجز و نیاز، خضوع و خشوع اور خشیت و انابت کی ایسی عجیب کیفیت طاری رہتی تھی جو شاذو نادر ہی کہیں دیکھنے میں آتی ہے۔ ہم جیسے کور ذوق اور حواس باختہ لوگوں کو تو اس کیفیت کا ادنیٰ ادراک بھی مشکل ہے آپ نے خود اپنے شیخؒ کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا :

> ”آخر شب کے نوافل میں بحمد اللہ اکثر شوق و رغبت اور سکون و طمانیت نصیب ہوتا ہے اور بعض اوقات کیفیت گریہ حالت اضطرار کو پہنچ جاتی تھی لیکن چونکہ یہ حالت مستمر نہ رہتی تھی، اس لئے میں اس کو خمود ہی سے تعبیر کرتا تھا، آج دفعۃً خیال ہوا کہ مبادا یہ ناشکری میں داخل ہو، اس لئے اصل حقیقت عرض کردی۔ آخر شب میں طول قیام اور طول سجود میں ایک خاص لذت پاتا ہوں اور جس رکن کو شروع کرتا ہوں، جب تک تھک نہ جاؤں اس سے منتقل ہونے کو جی نہیں چاہتا“ (مکتوب نمبر ۶۳)

نماز سے اس خصوصی تعلق کا اندازہ حضرتؒ کے ایک لطیف ارشاد سے کیجئے، ہم لوگوں کی عادت تھی کہ اکثر جب کوئی اہم کام سامنے ہوتا تو یہ جملہ کہہ دیتے تھے کہ ”ذرا نماز سے فارغ ہو جائیں تو پھر وہ کام کریں گے“ ایک روز حضرت والد صاحبؒ نے یہ جملہ سنا تو فرمایا :

"ارے بھائی، نماز فارغ ہونے کی چیز نہیں ہے' اس سے فراغت حاصل کرنے کی فکر نہیں چاہیے بلکہ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر نماز کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔"

اس کے بعد آپ نے قرآن کریم کی اسی آیت کی طرف متوجہ فرمایا جو ہم شب و روز پڑھتے رہتے ہیں لیکن اس کی حقیقت کی طرف کبھی دھیان نہیں ہوتا' فرمایا کہ قرآن کریم نے حضور سرور دو عالم صلی اللہ و سلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ

پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو (اللہ کی عبادت میں) تھکو' اور اپنے پروردگار کی طرف رغبت کا اظہار کرو۔

فرمایا کہ اس آیت میں حضورؐ سے خطاب ہو رہا ہے کہ آپ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر عبادت الٰہی میں اپنے آپ کو تھکائیں' اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اصلی یہ عبادت ہے اور اس سے جلد از جلد فارغ ہو کر دوسرے کاموں میں لگنے کی نیت ٹھیک نہیں' اس کے بجائے نیت یہ ہونی چاہیے کہ دوسرے کاموں سے جلد از جلد فارغ ہو کر نماز اور عبادت کی طرف متوجہ ہوں۔

ساتھ ہی حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں خاص طور پر اہل علم اور دینی خدمات انجام دینے والوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ یہ خطاب حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو رہا ہے کہ فارغ ہونے پر آپ عبادت الٰہی میں اپنے آپ کو تھکائیں۔ سوال یہ ہے کہ کس چیز سے فارغ ہونے پر؟ ظاہر ہے کہ عبادات کے علاوہ آپ کی جتنی مصروفیات تھیں وہ تمام تر دینی خدمات ہی سے متعلق تھیں، کبھی جہاد ہے، کبھی تعلیم و تبلیغ ہے، کبھی انتظام حکومت ہے، کبھی اصلاح خلق ہے' یہاں تک کہ آپؐ کی گھریلو زندگی بھی تعلیم ہونے کی بنا پر دینی خدمات ہی میں داخل تھی' اور آپؐ کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جو کسی نہ کسی ثواب کے کام میں خرچ نہ ہو رہا ہو۔ اس کے باوجود آپ کو یہ حکم ہو رہا ہے' کہ جب آپ اپنی دوسری دینی مصروفیات سے فارغ ہوں تو خالص عبادتوں کی طرف متوجہ ہوں' اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دینی' تبلیغی یا اجتماعی خدمات میں مصروف ہوں انہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم چونکہ شب و روز اللہ تعالیٰ کے دین ہی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے

ہمیں (معاذ اللہ) نفلی عبادتوں اور مستحبات و مندوبات کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون دینی خدمات انجام دے گا؟ جب اس کے باوجود آپؐ کو نفلی عبادات کا حکم دیا جارہا ہے اور اس کی تعمیل میں رات کے وقت آپؐ کے پاؤں پر ورم آجاتا ہے تو ہم کس شمار قطار میں ہیں؟

دوسرے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد' تعلیم و تبلیغ' اجتماعی خدمات اور دین کے لئے سیاست کی مصروفیات اگر صحیح نیت سے ہوں تو اگرچہ وہ سب کار ثواب ہیں اور بعض اوقات ان کا ثواب نفلی عبادات سے بھی بڑھ جاتا ہے' لیکن ان کو دین کا مقصود اصلی سمجھنا درست نہیں' اس کے بجائے مقصود اصلی وہی ٹھیٹھ عبادتیں ہیں جن میں بندہ براہ راست اپنے معبود سے رابطہ قائم کرکے اس کی طرف رجوع و انابت کی دولت حاصل کرتا ہے' اسی لئے یوں نہیں کہا گیا کہ نماز سے فارغ ہوکر جہاد یا تعلیم و تبلیغ کے کام میں لگو' بلکہ فرمایا یوں گیا کہ جب جہاد اور تعلیم و تبلیغ وغیرہ کے کام سے فارغ ہو تو اپنے اصل مقصد تخلیق یعنی عبادت رب کی طرف آجاؤ۔

یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جسے فراموش کرکے ہمارے بہت سے معاصر اہل قلم نے نظریاتی طور پر اور بہت سے رہنماؤں نے عملی طور پر دین کی تعبیر کو الٹ دیا ہے اور جو چیز مقصود اصلی تھی' اسے ذریعہ اور جو ذریعہ تھا اسے مقصود اصلی قرار دے دیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دین کا اصل مقصد جہاد و دعوت کے ذریعے اسلامی حکومت کا قیام ہے اور نماز روزے سمیت تمام عبادتیں اسی مقصد کی ٹریننگ دینے کے لئے وضع کی گئی ہیں' حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ دین کا اصل مقصد بندوں کا تعلق اپنے خالق و مالک سے جوڑ کر ان میں عجز و نیاز' انابت و خشیت اور عبدیت کی صفات پیدا کرنا ہے اور جہاد اور تعلیم و تبلیغ وغیرہ اس مقصد کے حصول کے ذرائع ہیں۔ لہٰذا ان دینی خدمات میں مشغولیت اگرچہ بڑی فضیلت کی بات ہے' یہ خدمات فرض کفایہ ہیں اور بعض مواقع پر فرض عین بھی ہوجاتی ہیں' لیکن یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ وہ نفلی عبادتیں جن میں براہ راست بندہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرکے اس کے سامنے اپنی بندگی اور عجز و نیاز کی پونجی نچھاور کرتا ہے' ان کی اہمیت اور مقصودیت میں فرق نہ واقع ہونے پائے اور جب کبھی انسان کو مہلت ملے وہ ان عبادتوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کو غنیمت کبریٰ اور اپنا منتہائے مقصود قرار دے' حضرت والد

صاحبؒ رحمتہ اللہ علیہ نے اسی فکر کو اپنے ایک شعر میں بیان فرمایا ہے ؎

خوش درس علم و شغل فتاویٰ بہ دیوبند
لیکن شمے بہ خانقہ تھانہ خوشتر است

اور حقیقت یہ ہے کہ اس اہم اور بنیادی نکتے کو فراموش کر کے ہم دین کے صحیح مزاج ومذاق اور اس کے حقیقی فوائد و ثمرات سے دور ہوتے جا رہے ہیں' اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس حقیقت کی صحیح فہم اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(۳) عبادت کی اصل روح تعلق مع اللہ اور انابت الی اللہ ہے۔ صوفیاء کرام کے یہاں جتنے مجاہدات ریاضتیں یا اذکار و اشغال کا معمول ہے' ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں بس جائے اور دل کسی وقت اس کے دھیان سے خالی نہ رہے "دست بکار و دل بیار" کی اس کیفیت کا ہم جیسوں کو تو ادراک بھی مشکل ہے' لیکن اس کیفیت کا اگر کوئی عملی پیکر ان بے حس نگاہوں نے بھی دیکھا تو وہ حضرت والد صاحبؒ قدس سرہ کی شخصیت تھی' سینکڑوں طرح کی ہمہ وقتی مصروفیت کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے قلب کا رابطہ مسلسل اپنے مالک و معبود سے قائم ہے' یہ کیفیت اصل میں تو نہاں خانہ قلب کی وہ خفیہ کیفیت ہے جسے عام حالات میں محسوس نہیں کیا جا سکتا' لیکن کبھی کبھی اس کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔

احقر کے شیخ و مربّی عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی نے بارہا اپنی مجلسوں میں بھی یہ بات بیان فرمائی ہے اور اپنی گرانقدر اور دریا بکوزہ کتاب "معمولات یومیہ" میں بھی تحریر فرمایا ہے کہ قلب کے چار اعمال ایسے ہیں کہ اگر انسان ان کی عادت ڈال لے تو اسے تعلق مع اللہ کی متمر دولت حاصل ہو سکتی ہے' یہ چار اعمال ہیں استغفار' صبر' شکر اور استعاذہ! حضرت مدظلہم نے فرمایا کہ انسان کو اپنی زندگی میں تین زمانوں سے سابقہ پیش آتا ہے' ماضی' حال اور مستقبل۔ انسان کو ماضی میں کئے ہوئے افعال پر ندامت ہوتی ہے تو اس کے لئے اسلام نے استغفار تجویز فرمایا ہے حال میں انسان کو یا تکلیف پیش آتی ہے یا راحت اور خوشی' پہلی صورت میں اس کا رد عمل صبر ہے' اور دوسری صورت میں شکر' اور مستقبل کے لئے انسان کو طرح طرح کے اندیشے ہوتے ہیں' ان کا علاج استعاذہ ہے' اگر انسان ماضی پر استغفار' حال پر صبر یا شکر اور مستقبل پر استعاذہ کی عادت

ڈال لے تو اس کا ہر لمحہ عبادت بن سکتا ہے۔ عادت ڈال لینے کے بعد ان عمال باطنہ میں کوئی وقت صرف نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کاموں میں مشغول رہتے ہوئے بھی کوئی اضافی محنت یا وقت خرچ کئے بغیر انسان مسلسل ان عبادتوں میں مصروف رہ سکتا ہے۔

جن لوگوں نے حضرت والد صاحبؒ قدس سرہ کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان چار عبادتوں نے آپ کی پوری زندگی کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ اور ذرا ذرا سی باتوں پر استغفار، شکر اور استعاذے کے کلمات آپ کے وردِ زبان رہتے تھے۔ خاص طور سے جب ادائے شکر کی نوبت آتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ کے انعامات کے تصور سے آپ پر بے خودی سی طاری ہو گئی ہے اور آپ کا پورا وجود عجز و نیاز کے ساتھ ادائے شکر میں مصروف ہے آپ ناگوار واقعات میں بھی قابل شکر پہلوؤں کو مستحضر رکھنے بلکہ ان کے کثرت سے ذکر کے عادی تھے۔ تکلیف دہ واقعات کی شکایت کا تو دستور ہی نہ تھا۔

جب کبھی آپ کو کسی معاملے میں تردّد ہوتا اور یہ فیصلہ کرنے کا مرحلہ آتا کہ دو راستوں میں سے کون سا راستہ اختیار کیا جائے تو چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کر کے گردوپیش سے بے خبر ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے ہدایت طلب فرماتے، اس کے بعد کوئی فیصلہ کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے اور کرتے رہنے کا معمول تھا۔

عبادات میں آپ کو اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ اپنی کسی عبادت کی وجہ سے دوسروں کو کوئی ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے، خاص طور سے غیر واجب عبادات میں اس بات کا پورا لحاظ رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ عبادت واجب نہیں، لیکن کسی مسلمان کو ایذا سے بچانا فرض ہے لہٰذا ایک غیر واجب کی ادائیگی کے لئے فرض کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے، چنانچہ آپ تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اس بات کا اہتمام کرتے کہ کسی دوسرے کی نیند خراب نہ ہو، عموماً قراءت بھی آہستہ فرماتے۔ البتہ رمضان المبارک کی راتوں میں سحری سے پہلے جو نفلیں پڑھتے ان میں عموماً بلند آواز میں قراءت کا معمول تھا اور اب خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان کے عشرہ اخیرہ میں آپ اپنے گھر والوں کو بھی جگانے کا اہتمام فرماتے تھے، واللہ سبحانہ اعلم۔

آپ اس بات سے بھی حتی الوسع پرہیز فرماتے تھے کہ آپ کی وجہ سے کسی مسجد میں

نماز کو اپنے مقررہ وقت سے مؤخر کیا جائے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اہل مسجد کی طرف سے آپ کو یہ پیشکش کی گئی مگر آپ نے اسے کبھی پسند نہیں فرمایا' اور اگر مقررہ وقت پر مسجد پہنچنے میں کوئی عذر ہوا تو مسجد کے بجائے اپنی جماعت الگ کر لینے کو ترجیح دی۔

دارالعلوم کی مسجد میں نماز ظہر کا جو وقت مقرر تھا وہ آپ کے معمولات کے لحاظ سے مناسب نہ تھا۔ آپ عموماً ایک بجے تک دارالعلوم کے دفتر میں بیٹھے کام کرتے رہتے تھے اور اس سے پہلے اٹھنا آپ کے لئے ممکن نہ تھا اور ایک بجے کے بعد تھکن اتنی ہو جاتی تھی کہ مزید بیٹھنا مشکل ہوتا تھا' چنانچہ آپ ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان اٹھتے تھے اور نماز کا وقت عموماً دو یا ڈھائی بجے مقرر ہوتا تھا۔ اب ڈیڑھ بجے سے دو یا ڈھائی بجے تک نماز کا انتظار آپ کے لئے بہت دشوار ہوتا تھا۔ اور اس دوران اگر کھانا کھالیں تو کھانے کے بعد نماز کا اہتمام معالجین کی ہدایت کے مطابق آپ کے لئے مضر صحت تھا۔ اس بناء پر ہم لوگوں نے بھی اور دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ و منتظمین نے بھی بارہا عرض کیا کہ نماز کا وقت مقدم کر کے ڈیڑھ بجے کر دیا جائے' تاکہ آپ دفتر سے اٹھتے ہی نماز پڑھ سکیں۔ یہ صورت آپ کے لئے بے حد سہولت کا باعث ہوتی لیکن آپ نے کبھی اس کو منظور نہیں فرمایا۔ اور ہمیشہ اس بنا پر انکار فرما دیا کہ عام اساتذہ و طلبہ کی سہولت کا وقت وہی ہے کیونکہ وہ بارہ بجے چھٹی ہونے پر کھانا کھا کر کچھ آرام کرتے ہیں اور اٹھ کر نماز پڑھتے ہیں' نماز کو مقدم کرنے سے ان کے آرام میں خلل واقع ہوگا۔ چنانچہ سالہا سال آپ نے اس مشقت کو برداشت کیا کہ دو ڈھائی بجے تک نماز کا انتظار کر کے نماز کے بعد کھانا کھاتے اور آخر عمر میں جب دل کی تکلیف کی وجہ سے اس مشقت کو برداشت کرنا ممکن ہی نہ رہا تو آپ نے عذر کی بنا پر انفراداً نماز پڑھنے کو ترجیح دی اور وقت بدلنا کسی قیمت پر گوارا نہ فرمایا اور وقت بدلنے کی پیشکش کو ہمیشہ یہ کہہ کر رد فرما دیا کہ "محض اپنے عمل بالعزیمہ کی خاطر میں پورے مدرسے کو تکلیف میں نہیں ڈال سکتا' میں کمزور ہوں اور اللہ تعالیٰ نے جو رخصت عطا فرمائی ہے اس پر عمل کرنا میرے لئے اہون ہے"۔

عزیمت و رخصت کے باب میں بھی حضرت والد صاحبؒ کا مذاق یہ تھا کہ اس بات کی تو پوری تحقیق اور اطمینان فرما لیتے تھے کہ اس حالت میں شرعاً رخصت حاصل ہے یا نہیں؟ ——— لیکن جب کسی وقت رخصت کا اطمینان ہو جاتا تو رخصت پر بھی اسی انشراح

کے ساتھ عمل فرمائے۔ جس انشراح کے ساتھ عزیمت پر عمل فرماتے تھے' حدیث نبوی ہے کہ :

ان اللہ یحب ان تؤتی رخصہ کما یحب ان تؤتی عزائمہ

(اللہ تعالیٰ کو رخصتوں پر عمل بھی اسی طرح پسند ہے جس طرح عزیمت پر)

اس حدیث پر آپ کا پورا عمل تھا' اور دوسروں کو نصیحت فرماتے ہوئے آپ حضرت مولانا رومیؒ کا یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے۔

چوں کہ برمیخت بہ بندد' بستہ باش
چوں کشاید' چابک و برجستہ باش

لیکن اس بات کا اطمینان کرتے وقت کہ شرعاً رخصت حاصل ہے یا نہیں؟ آپ انتہائی باریک بینی سے کام لیتے اور جب تک آپ کو مکمل اطمینان نہ ہو جاتا' رخصت پر عمل نہ فرماتے۔ بیماری کے دوران اگر ذرا بھی شبہ ہوتا کہ تیمم جائز ہے یا نہیں؟ آپ وضو ہی فرماتے' خواہ اس کے لئے کتنی مشقت اٹھانی پڑے۔ آخر عمر میں معالجین اس بات پر متفق تھے کہ روزہ رکھنا آپ کے لئے مضر ہے لیکن ہر رمضان میں آپ اس بات پر اصرار فرماتے کہ میں کم از کم ایک روزہ رکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس سے مرض میں کوئی اشتداد پیدا ہوتا ہے یا نہیں؟ اس غرض کے لئے آپ نے ایک روز چپکے چپکے سحری بھی کھالی' جب ہمیں علم ہوا اور ہم نے احتجاج کیا تو فرمایا کہ: "مجھے روزہ رکھ کر دیکھنے تو دو" ہم نے عرض کیا کہ "آپ تو دوسروں کو "ان اللہ یحب ان تؤتی رخصہ" والی حدیث اکثر سنایا کرتے ہیں' آپ نے فرمایا کہ میں اسی بات کا تو اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ رخصت واقعتہً حاصل ہے یا نہیں؟ جب یہ اطمینان ہو جائے گا تو وعدہ کرتا ہوں کہ پھر روزہ رکھنے پر اصرار نہیں کروں گا۔ چنانچہ سحری ہی میں ڈاکٹر صاحب کو فون کیا گیا' ان سے بھی والد صاحبؒ نے وہی بات فرمائی کہ میں تجربتہً روزہ رکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ یہ تجربہ آپ کے لئے سخت مضر ہو سکتا ہے' اور اگر خدانخواستہ کوئی مضرت پہنچ گئی تو پھر اس کو سنبھالنا مشکل ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ بات سننے کے بعد آپ نے ہتھیار ڈال دیئے اور پھر اصرار نہیں فرمایا۔

دعوت و تبلیغ

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی عملی زندگی کے بیشتر شعبے دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت ہی سے متعلق تھے، جن میں عوام و خواص دونوں کو تبلیغ حق کے کام شامل تھے۔ اور تبلیغ و دعوت کے اصولوں کے بارے میں آپ کا ایک سوچا سمجھا نظریہ تھا جسے آپ اکثر اہل علم کی مجلسوں میں بیان فرمایا کرتے تھے۔

اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعوت و تذکیر کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اس سے فائدہ ضرور پہنچتا ہے، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے :

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ

اور آپ نصیحت کیجئے، اس لیے کہ نصیحت مسلمانوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

لیکن اگر ہم لوگوں کو اپنی دعوت و تبلیغ کا کوئی کام بے اثر یا غیر مفید معلوم ہوتا ہے تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم نے دعوت کے پیغمبرانہ اسلوب کو چھوڑ دیا ہے۔ دعوت درحقیقت انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور جب تک اسے انہی طریقوں کے مطابق انجام نہیں دیا جائے گا جس طرح انبیاء علیہم السلام نے انجام دیا، اس وقت تک مؤثر نہیں ہو سکتا۔

پیغمبرانہ دعوت کے چند اصول

حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ پیغمبرانہ دعوت کے چند امتیازی خصائص یہ ہیں :

(۱) امت کی فکر : انبیاء علیہم السلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو اپنی امت کی اصلاح کی فکر اس قدر شدت کے ساتھ لگ جاتی ہے کہ وہ طبعی تقاضوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ جب پیغمبر اس فکر میں گھلنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی کا سامان کیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے :

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ

شاید آپ اس غم میں اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں کہ یہ لوگ مومن

کیوں نہیں بنتے۔

لہٰذا داعئ اسلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کو اس پیغمبرانہ فکر کا کوئی حصہ نصیب ہو۔ چنانچہ اسلاف امت میں سے جن جن کو اس فکر کا جتنا حصہ ملا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت میں اتنی ہی برکت عطا فرمائی اور اتنے ہی بہتر ثمرات پیدا فرمائے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ کو دعوت و تبلیغ کا ایسا تقاضا ہوتا تھا جیسا بھوک کے وقت کھانے اور پیاس کے وقت پینے کا تقاضا ہوتا ہے، جس طرح انسان ان طبعی تقاضوں سے صبر نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ دعوت کے مواقع پر دعوت سے صبر نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت میں تاثیر بھی ایسی عطا فرمائی کہ ان کے ایک ایک وعظ سے سینکڑوں انسان بیک وقت تائب ہوتے تھے۔

(۲) دعوت کی لگن : انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا دوسرا اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر دعوت میں لگاتار مشغول رہتے ہیں اور حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی بات متواتر کہے چلے جاتے ہیں، جہاں اور جس موقع پر کسی شخص کو اچھی بات پہنچانے کا کوئی موقع مل جائے وہ اسے غنیمت سمجھ کر اپنی بات پہنچا ہی دیتے ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ اس کی مثال میں فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھیے کہ وہ مدت سے عزیز مصر کی قید میں محبوس ہیں، گرد و پیش میں کوئی ہم نوا نہیں، اس حالت میں جیل کے دو ساتھی خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے آتے ہیں، سوال کا کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں ہے لیکن ان کے جواب میں پہلے تو انہیں مطمئن فرما دیتے ہیں کہ تمہارے خواب کی تعبیر مجھے معلوم ہے اور میں تمہیں بتا بھی دوں گا مگر پہلے ایک بظاہر قطعی غیر متعلق بات شروع کردیتے ہیں، اور وہ یہ کہ :

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ

بلاشبہ میں نے ان لوگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنے آباؤ اجداد میں سے حضرت ابراہیم، حضرت

حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) کے دین کی پیروی کی ہے۔

اور :

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

اے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق پروردگار (ماننا) بہتر ہیں یا وہ اللہ جو ایک اور قہار ہے۔

اور اس طرح خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے اپنا پیغام انہیں پہنچا دیا۔

دعوت کی اس لگن کا حاصل یہ ہے کہ انسان بات پہنچانے کے مواقع کی تلاش میں رہے جب جتنا موقع مل جائے اس سے فائدہ اٹھائے اور دعوت سے کسی مرحلے پر تھکنے یا اکتانے کا نام نہ لے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کا داروغہ بن کران کے پیچھے نہ پڑے' بلکہ اپنی بات مؤثر سے مؤثر انداز میں کہہ کر فارغ ہو جائے' پھر جب دیکھے کہ اس پر عمل نہیں ہوا تو موقع دیکھ کر پھر کہہ دے لیکن نہ مسلط ہونے کا طریقہ اختیار کرے اور نہ مایوس ہو کر بیٹھے۔

(۳) مخاطب کی شفقت : پیغمبرانہ دعوت کا تیسرا اہم عنصر "مخاطب کی شفقت" ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا داعیہ شفقت کے سوا کچھ نہیں ہوتا' اپنی برتری جتلانے یا دوسرے کی تحقیر کا ان کے یہاں شائبہ نہیں' حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم نے بیشتر مواقع پر تبلیغ و دعوت کو لفظ "انذار" سے تعبیر فرمایا ہے جس کا لفظی ترجمہ لوگ صرف "ڈرانا" کرتے ہیں لیکن درحقیقت عربی زبان میں "انذار" اس ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا محرک دوسرے پر شفقت ہو' جیسے باپ بیٹے کو آگ سے ڈراتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک ظالم حکمران اپنے کسی محکوم کو کسی سزا سے ڈرائے تو اس کو "انذار" نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا اس لفظ کے انتخاب سے اسی طرف متوجہ کرنا ہے کہ داعئ حق جن کو نصیحت کرتا ہے' ان سے نفرت یا ان کی حقارت اس کے دل میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا محرک شفقت ہی شفقت ہوتا ہے' جس طرح ایک طبیب کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی بیمار سے نفرت کرے اور جو طبیب نفرت کا مرتکب ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا' اسی طرح داعی کو بھی بدتر سے بدتر کافر یا فاسق و فاجر سے نفرت نہیں ہونی چاہئے' بلکہ اس کے افعال سے نفرت کرکے اس پر رحم کھانا چاہیے اور اس کی دعوت میں اس رحم اور شفقت کی جھلک محسوس ہونی چاہیے۔

(۴) حکمت : پیغمبرانہ دعوت کی چوتھی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کے لیے ایسا موقع اور ایسا ماحول تلاش کرتے ہیں جس سے ان کی بات زیادہ سے زیادہ موثر ہوسکے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ اس کی بہت سی مثالیں دیا کرتے تھے۔ فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک بے تکلف دوست تھے جو آزاد منش واقع ہوئے تھے۔ وضع قطع میں کسی طرح حضرت مولاناؒ کے دوست قرار پانے کے اہل معلوم نہیں ہوتے تھے' اسی زمانے میں ڈاڑھی چڑھانے کا فیشن تھا' وہ اس فیشن پر بھی عمل کرنے کے عادی تھے اور کپڑے بھی علماء و صلحاء کی وضع کے خلاف پہنتے تھے۔ بعض لوگ حضرت نانوتویؒ پر تعجب بھی کرتے تھے کہ ایسے صاحب کو حضرتؒ نے دوست کیسے بنالیا؟ اور کبھی لوگ پوچھتے بھی تھے کہ آپ ان کو سمجھاتے کیوں نہیں؟ لیکن حضرت نانوتویؒ ہمیشہ طرح دے جاتے اور ان کے ساتھ اسی طرح دوستانہ بے تکلفی سے پیش آتے' اسی طرح بہت دن گزر گئے۔ ایک روز وہ صاحب آئے ہوئے تھے' حضرت نانوتویؒ نے ان سے فرمایا : "بھائی ہمیں بھی اپنے جیسے کپڑے سلوادو۔" انہوں نے پوچھا : "کیوں؟" فرمایا : "ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ ہی جیسا لباس پہنا کریں' دوستوں کے درمیان لباس کی مغایرت اچھی معلوم نہیں ہوتی' اور یہ لو' میری ڈاڑھی موجود ہے' اس کو اپنی ڈاڑھی کی طرح چڑھادو۔" یہ سن کر وہ صاحب پانی پانی ہوگئے' اور عرض کیا کہ : "حضرت! آپ کو اپنی وضع بدلنے کی ضرورت نہیں' آج سے انشاء اللہ میرا لباس اور تراش خراش آپ کے طرز کے مطابق ہوگی۔"

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ اس واقعے کو نقل کرکے فرمایا کرتے تھے کہ جب داعیٔ حق کے دل میں جذبہ' لگن اور للّٰہیت ہوتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر حکمت کا القاء فرماتے ہیں' اور اسے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ کون سی بات کہنے کے لیے کون سا موقع مناسب ہوگا؟

(۵) موعظہ حسنہ : پیغمبرانہ دعوت کا پانچواں اہم اصول یہ ہے کہ وہ دعوت کے لیے انداز بیان اور اسلوب ایسا اختیار فرماتے ہیں جو نرمی' ہمدردی اور دلسوزی کا آئینہ دار ہو۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ ہدایت فرمائی کہ :

فَقُولَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا

تم دونوں اس سے نرم بات کہنا

اب کوئی شخص فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہو سکتا' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑا مصلح اور داعی نہیں ہو سکتا' جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے داعی کو فرعون جیسے گمراہ سے بھی نرم بات کہنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو ہمہ شما کی کیا حقیقت ہے؟

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا اندازِ دعوت و تبلیغ حتی الامکان انہی اصولوں کے مطابق ہوتا تھا' ایک مرتبہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کسی سفر پر ریل میں جا رہے تھے' ساتھ ایک الٹرا ماڈرن قسم کے افسر بھی سفر کر رہے تھے' شروع میں وہ اجنبیت کی بناء پر کھنچے کھنچے سے رہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں مانوس ہو کر گفتگو کرنے لگے' مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ حضرت والد صاحبؒ سفر میں اپنے رفقاء کو راحت پہنچانے کے لیے ایثار و خدمت کے عادی تھے' چنانچہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ فرمایا' یہاں تک کہ کسی نماز کا وقت آگیا' حضرت والد صاحبؒ اس موقع پر چپکے سے اٹھے اور نماز پڑھ کر آگئے۔ اس وقت ان صاحب نے کہا : "مولانا! جب آپ نماز کے لیے اٹھنے والے تھے تو مجھے یہ خیال ہو رہا تھا کہ آپ شاید مجھے بھی نماز کے لیے کہیں گے لیکن چونکہ میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا' اس لیے اگر آپ اس بارے میں کچھ فرماتے تو مجھ پر بار بھی ہوتا اور شاید میں عذر بھی کر دیتا' لیکن آپ کے اس طرز عمل نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ اب میں ذہنی طور پر بالکل تیار ہوں اور آئندہ آپ کے ساتھ میں بھی نماز پڑھا کروں گا۔"

دوسرے فرقوں کی تردید

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے تقریباً تمام فرقوں کی تردید میں کتابیں یا مقالے تحریر فرمائے اور ابتدائی زمانے میں متعدد معرکے کے مناظرے بھی کیے لیکن اس بارے میں بھی حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا مذاق یہ تھا کہ یہ تردید و تنقید قرآن کریم کی اصطلاح میں جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ کی حدود سے متجاوز نہ ہو۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ باطل فرقوں کی تردید بھی درحقیقت دعوت و تبلیغ ہی کی ایک قسم ہے' لہٰذا اس میں بھی حکمت' موعظۂ حسنہ اور مجادلہ بالّتی ہی

احسن کے اصولوں پر عمل ضروری ہے، آج کل دوسروں کی تردید میں طعن و تشنیع، طنزو تعریض اور فقرے کسنے کا جو انداز عام ہوگیا ہے، حضرت والد صاحبؒ اس کے سخت مخالف تھے اور فرماتے تھے کہ اس سے اپنے ہم خیال لوگوں سے داد تو وصول ہو جاتی ہے لیکن اس سے مخالفین کے دل میں ضد اور عناد پیدا ہو جاتا ہے اور کسی کا ذہن بدلنے میں مدد نہیں ملتی۔

تردید میں طعن و تشنیع کا انداز

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں آغاز شباب میں دوسروں کی تردید کے لیے بڑی شوخ اور چلبلی تحریر لکھنے کا عادی تھا اور تحریری مناظروں میں میرا طرز تحریر طنزو تعریض سے بھرپور ہوتا تھا، اور "ختم نبوت" میں نے اسی زمانے میں لکھی تھی، لیکن اس کے شائع ہونے کے بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے میرے اندازِ تحریر کا رخ بدل دیا اور وہ یہ کہ میرے پاس ایک قادیانی کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ آپ نے اپنی کتاب "ختم نبوت" میں جو دلائل پیش کیے ہیں، بنظر انصاف پڑھنے کے بعد وہ مجھے بہت مضبوط معلوم ہوتے ہیں، اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں مرزا صاحب کی اتباع سے تائب ہو جاؤں لیکن آپ نے اس کتاب میں جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ مجھے اس اقدام سے روکتا ہے، میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں وہ دلائل پر اکتفا کرتے ہیں، طعن و تشنیع سے کام نہیں لیتے، اس لیے میں اب تک اپنے مذہب پر قائم ہوں اور آپ کے طعن و تشنیع نے دل میں کچھ ضد بھی پیدا کردی ہے۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ یہ تو معلوم نہیں کہ ان صاحب نے یہ بات کہاں تک درست لکھی تھی، لیکن اس واقعے سے مجھے یہ تنبّہ ضرور ہوا کہ طعن و تشنیع کا یہ انداز مفید کم ہے اور مضر زیادہ، چنانچہ اس کے بعد میں نے "ختم نبوت" پر اس نقطۂ نظر سے نظر ثانی کی، اور اس میں ایسے حصے حذف کردیے جن کا مصرف دل آزاری کے سوا کچھ نہ تھا اور اس کے بعد کی تحریروں میں دل آزار اسلوب سے مکمل پرہیز شروع کردیا۔

فرماتے تھے کہ ہمیں انبیاء علیہم السلام کے طریق کار سے سبق لینا چاہیے کہ وہ ہمیشہ گالیوں اور طعنوں کے جواب میں پھول برساتے رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کی سخت کلامی کا جواب بھی نہیں دیا مثلاً حضرت ہود علیہ السلام سے ان کی قوم کہتی ہے کہ :

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ

بلاشبہ ہم آپ کو بے وقوفی میں مبتلا پاتے ہیں اور آپ کو جھوٹا سمجھتے ہیں

اس فقرے میں انہوں نے بیک وقت جھوٹا ہونے اور بے وقوف ہونے کا طعنہ دیا ہے والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ اگر آج کا کوئی مناظر ہوتا تو جواب میں ان کے باپ دادا کی بھی خبر لاتا، لیکن سنیے کہ اللہ کا پیغمبر کیا جواب دیتا ہے؟

یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اے قوم! میں بے وقوفی میں مبتلا نہیں ہوں، بلکہ میں تو پروردگار عالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں

دعوت کا کام انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہے، اس لیے اس میں غصہ نکالنے، طنز کے تیرو نشتر چلانے یا فقرے کس کر چٹخارے لینے کا کوئی موقع محل نہیں، اس کام میں تو نفسانیت کو کچلنا پڑتا ہے اور اس کے لیے دوسروں کی گالیاں کھا کر بھی دعائیں دینے کا حوصلہ چاہیے۔

اسی ضمن میں حضرت والد صاحب قدس سرہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید صاحب قدس سرہ وعظ کہنے کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ اتنے میں مخالفین میں سے کوئی شخص سامنے آگیا اور اس نے مولاناؒ کی تحقیرو تذلیل کی غرض سے کہا :

"مولانا! میں نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں؟"

تصور تو فرمائیے کہ یہ بات اس شخص سے کہی جارہی ہے جو ایک طرف علم و فضل کا دریائے بیکراں اور دوسری طرف خاندانی طور پر مسلّم شہزادہ اور جس نے دین کی خاطر اپنے سارے شاہی ٹھاٹھ باٹھ کو تج کر رکھ دیا، اور پھر یہ بات اس وقت کہی جارہی ہے جب وہ وعظ کہہ کر اتر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت ان کے کچھ نہ کچھ معتقدین یا ہم خیال حضرات بھی ساتھ ہوں گے، آج اگر کسی واعظ سے ایسے ماحول میں یہ بات کہی جائے تو واعظ صاحب برافروختہ ہو کر اس کے حسب و نسب کو معرض بحث میں لے آئیں گے اور ان کے رفقاء یقیناً ایسے شخص کو سلامت نہ جانے دیں گے لیکن بے نفسی کی انتہا دیکھیے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے جواب میں فرمایا :

"جناب! آپ کو کسی نے غلط خبر پہنچائی، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو
اب تک دہلی میں موجود ہیں۔"

اور اس طرح حضرتؒ نے معترض کے اس فقرے کو جو صرف گالی دینے کے لیے بولا گیا تھا ایک مسئلہ بنا کر سنجیدگی سے جواب دے دیا۔ یہی وہ طرز عمل تھا جس نے سنگدل سے سنگدل انسانوں کو موم کیا اور جس کی بناء پر دعوت حق کی فضا ہموار ہوئی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کا یہ واقعہ بھی حضرت والد صاحبؒ بار بار سنایا کرتے تھے کہ ایک سفر میں وعظ سے پہلے انہیں کسی کا ایک خط موصول ہوا۔ جس میں لکھا تھا کہ : "ہم نے سنا ہے کہ آپ کافر ہیں اور جلاہے ہیں" اور یہ کہ "اگر آپ نے یہاں وعظ میں اختلافی مسائل چھیڑے تو آپ کی خیر نہیں۔" حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس خط پر مشتعل ہونے کے بجائے وعظ کے آغاز میں لوگوں کو وہ خط پڑھ کر سنایا اور اس کے بعد فرمایا :

"اس خط میں تین باتیں کہی گئی ہیں، پہلی بات تو یہ کہ میں کافر ہوں، اس کا جواب تو یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے کلمہ پڑھتا ہوں اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله اب اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ میں کافر ہوں یا نہیں؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس کلمے کی بدولت ستر برس کا کافر بھی مسلمان ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر بالفرض خدانخواستہ میں کبھی کافر تھا بھی تو اس کلمے کے بعد مسلمان ہو گیا، لہٰذا اس بحث کی ضرورت نہیں۔"

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ میں جلاہا ہوں، اس کا جواب یہ ہے کہ میں یہاں کوئی نکاح کا پیغام لے کر نہیں آیا جس کے لیے اس تحقیق کی ضرورت ہو، اگر بالفرض میں جلاہا ہوں مگر دین کی کوئی صحیح بات بتاتا ہوں تو محض جلاہا ہونے کی بناء پر اسے رد نہیں کرنا چاہیے، ویسے اگر کسی کو واقعی میرے نسب کی تحقیق مقصود ہو تو تھانہ بھون کے لوگوں سے خط لکھ کر تحقیق کر لے۔"

تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ میں وعظ میں کوئی اختلافی مسئلہ بیان نہ

کروں' سو اس کا جواب یہ ہے کہ میں یہاں وعظ کہنے کے لیے خود نہیں آیا' مجھے اس مقصد کے لیے بلایا گیا ہے' اگر اس مجمع میں سے کوئی ایک صاحب بھی اٹھ کر مجھے وعظ کہنے سے منع فرمادیں گے تو میں وعظ نہیں کہوں گا اور وعظ میں میری عادت اختلافی مسائل کو موضوع بنانے کی نہیں ہے' لیکن اگر اثناء وعظ میں کوئی اختلافی مسئلہ آجاتا ہے اور اس کی وضاحت ضروری ہوتی ہے تو پھر اس کے بیان سے میں رکتا بھی نہیں یہی عمل اس وقت بھی ہو گا' اب اگر آپ بات سننا چاہیں تو میں شروع کروں' ورنہ رک جاؤں۔"

اس اندازِ کلام کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی ایک شخص نے بھی وعظ میں رکاوٹ نہ ڈالی' اور پھر جب وعظ شروع ہوا تو اس میں اتفاق سے بہت سے اختلافی مسائل بھی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے اور بہت سے مخالفین اتنے متاثر ہوئے کہ ہم خیال بن گئے۔

اکبر الٰہ آبادی اور اقبال مرحوم

حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اردو زبان میں دو ایسے شاعر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری سے دین کی خدمت کی ہے اور اس سے دینی فکر کی اشاعت کا کام لیا ہے' ایک اکبر الٰہ آبادی مرحوم ہیں اور دوسرے ڈاکٹر اقبال مرحوم' ان دونوں میں سے اکبر الٰہ آبادی مرحوم کے یہاں فکری سلامتی اقبال مرحوم کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اکبر مرحوم کی فکر ٹھیٹھ دینی فکر ہے اور ان کے یہاں حکمت کی بھی فراوانی ہے' اقبال مرحوم کی فکر بھی اگرچہ مجموعی اعتبار سے دینی فکر ہے مگر اس میں اس درجہ سلامتی نہیں' اس کے باوجود یہ بات واضح طور سے نظر آتی ہے کہ اقبال کی شاعری جتنی مؤثر ہوئی اور اس سے جتنا فائدہ پہنچا' اکبر مرحوم کی شاعری اس درجہ مؤثر نہیں ہوئی' میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ اکبر مرحوم نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے طنزو تعریض کا طریقہ اختیار کیا اور طنز کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے ہم خیال لوگ لطف تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس سے کوئی موثر اصلاحی کام نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات مخالفین میں ضد پیدا ہو جاتی ہے۔

تصلب اور عناد کا فرق

خلاصہ یہ کہ مثبت دعوت و تبلیغ ہو یا کسی باطل نظریئے کی تردید، حضرت والد صاحب قدس سرہ کا مذاق دونوں میں یہ تھا کہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہنے کے باوجود طعن و تشنیع اور دل آزار اسلوب بیان سے مکمل پرہیز کیا جائے اور اس کے بجائے ہمدردی و دلسوزی اور نرمی و شفقت سے کام لے کر ذہنوں کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن اس نرمی کا یہ مطلب نہیں کہ حق کو حق یا باطل کہنے میں مداہنت سے کام لیا جائے کیونکہ کفر کو کفر تو کہنا ہی پڑے گا۔ لیکن مطلب یہ ہے کہ حقیقت کے ضروری اظہار کے بعد محض اپنی نفسانیت کی تسکین کے لیے فقرہ بازیاں نہ کی جائیں، حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ داعئ حق کی مثال ریشم جیسی ہونی چاہیے کہ اس کو چھو کر دیکھو تو اتنا نرم و ملائم کہ ہاتھوں کو حظ نصیب ہو لیکن اگر کوئی اسے توڑنا چاہے تو اتنا سخت کہ تیز دھار بھی اس پر پھسل کر رہ جائے۔

چنانچہ مباحثہ تحریری ہو یا زبانی، حضرت والد صاحبؒ حق کے معاملے میں ادنیٰ لچک کے روادار نہیں تھے، لیکن بات کہنے کا طریقہ ہمیشہ ایسا ہوتا، جس سے عناد کے بجائے دلسوزی، حق پرستی اور للّٰہیت مترشح ہوتی تھی۔ چنانچہ جس شخص سے کبھی قلمی مباحثہ رہا ہو، وہ اگر کبھی سامنے آجائے تو نہ آپ کے انداز گفتگو اور انداز تحریر میں کوئی فرق ہوتا تھا، اور نہ آپ کو کبھی اس بناء پر شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی کہ جس شخص کے بارے میں حد سے گذرے ہوئے الفاظ لکھ چکا ہوں، اس کا سامنا کیسے کروں؟ آپ مخالف نقطۂ نظر والوں کو زبانی گفتگو میں بھی حق کے معاملے میں سخت سے سخت بات کہہ دیتے لیکن وہ کبھی یہ تاثر لے کر نہیں اٹھتا تھا کہ اس سختی کا سبب کوئی عناد ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں مجھے یاد ہیں جن میں آپ نے بڑے بڑے ذی اثر لوگوں کو خوب کھری کھری سنائیں لیکن ایسا ایک واقعہ یاد نہیں کہ ان کی بناء پر کوئی عناد کا تاثر لے کر گیا ہو۔

احتیاط و تثبت

دوسرے نظریات کی تردید میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کا ایک اصول یہ تھا کہ جس شخص یا گروہ پر تنقید کی جارہی ہے، پہلے اس کے نظریات و افکار اور اس کے منشاء و مراد

کی اچھی طرح تحقیق کرلی جائے اور اس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ کی جائے جو اس نے نہیں کہی یا جو اس کی عبارتوں کے منشاء و مراد کے خلاف ہو۔

آج کل بحث و مباحثہ اور مناظروں کی گرم بازاری میں احتیاط و تثبت کے اس پہلو کی رعایت بہت کم کی جاتی ہے اور دوسرے کی تردید کے جوش میں اس کی غلطی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنیکی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح بعض ایسی باتیں مخالف کی طرف منسوب کردی جاتی ہیں جو اس نے نہیں کہی ہوتیں۔ یہ طرز عمل اول تو انصاف کے خلاف ہے' دوسرے اس سے تردید کا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا اور بسا اوقات اس کے نتیجے میں بحث و مباحثہ کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو افتراق و انتشار پر منتج ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت والد صاحب قدس سرہ نے احقر کو اس زرّیں اصول کی تلقین فرمائی تھی کہ یوں تو انسان کو اپنے ہر قول و فعل میں محتاط ہونا چاہیے لیکن خاص طور پر جب دوسروں پر تنقید کا موقع ہو تو ایک ایک لفظ یہ سوچ کر لکھو کہ اسے عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا اور کوئی ایسا دعویٰ جزم کے ساتھ نہ کرو جسے شرعی اصولوں کے مطابق ثابت کرنے کے لئے کافی مواد موجود نہ ہو۔ حضرت والد ماجد قدس سرہ کی اس نصیحت نے احقر کو جس قدر فائدہ پہنچایا اور اس کے جن بہتر ثمرات کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوا انہیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

خود حضرت والد صاحبؒ کی تحریروں میں احتیاط کا یہ پہلو جس قدر نمایاں ہے اور اس کے پیش نظر آپ کی عبارت میں جو قیود و شرائط ملتی ہیں ان کی مثالیں دینا چاہوں تو ایک پورا مقالہ اس کے لیے چاہیے لیکن یہاں ایک واضح مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

خاکسار تحریک کے بانی عنایت اللہ مشرقی صاحب نے ایک زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا' ان کے عقائد و نظریات جمہور امت سے بہت سے معاملات میں مختلف تھے' اور بعض نظریات تو ایسے تھے کہ دائرہ اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے ایماء پر حضرت والد صاحبؒ نے ان کے نظریات کی تردید میں ایک رسالہ تحریر فرمایا جو "مشرقی اور اسلام" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ رسالہ تو مختصر سا ہے لیکن حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس کی ترتیب میں بڑی محنت اٹھائی ' اول تو مشرقی صاحب کی تمام

معروف تصانیف کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ پھر ان کے جن مقامات پر جمہور امت سے ناقابل برداشت انحراف نظر آیا' ان کو قلمبند کیا' اور پھر مزید احتیاط یہ کی کہ ان عبارتوں کو جمع کر کے مشرقی صاحب کے پاس بھیجا کہ ان عبارتوں سے آپ کی مراد وہی ہے جو ان سے ظاہر ہوتی ہے یا آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟ ان کی طرف سے کوئی واضح جواب نہ آیا تو انہیں دوبارہ خط لکھا' اور یہ خط و کتابت کافی عرصے تک جاری رہی' یہاں تک کہ جب اس خط و کتابت کے نتیجے میں یقین ہو گیا کہ مراد وہی ہے جو ان کی عبارتوں سے ظاہر ہے تو پھر اس پر تردید تحریر فرمائی۔ یہ رسالہ پہلے مستقل شائع ہوا تھا اور اب "جواہر الفقہ" میں شامل ہے۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے بارے میں حضرت والد صاحب قدس سرہ نے ایک زمانے تک کسی واضح اور حتمی تحریر کی اشاعت سے گریز فرمایا لیکن درحقیقت آپ کے اس طرز عمل کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ آپ کا سوچا سمجھا موقف یہ تھا کہ اس نازک دور میں جبکہ اسلام کی بنیادوں پر کھلے کفر و الحاد کی یورش انتہا کو پہنچی ہوئی ہے' مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو باقاعدہ محاذ جنگ اور معرکۂ کارزار بنانا اسلام کے مقاصد کے لئے مضر ہوگا' اس لیے آپ اس دور میں علمی طور پر اپنے مسلک و موقف کی وضاحت اور دوسرے موقف پر تنقید کو بھی ضروری سمجھتے تھے لیکن اس علمی تنقید کے لیے وہی احتیاط و تثبت اور تحقیق لازمی تھی' حضرت والد صاحبؒ کو اس ضرورت کا ہمیشہ احساس رہا کہ مولانا مودودی صاحب سے جن مسائل و نظریات میں جس درجے کا اختلاف ہے' اسے یا تو افہام و تفہیم کے ذریعے ختم یا کم کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس اختلاف کی وضاحت کر کے اس پر علمی تنقید و تردید کی جائے لیکن آپ کی مصروفیات اس قدر گوناگوں تھیں کہ آپ کو مدت تک اس بات کا موقع نہیں مل سکا کہ مولانا مودودی صاحب کی کتابوں کا خود مطالعہ کر سکیں اور سنی سنائی باتوں یا دوسروں کے دیے ہوئے اقتباسات کی بنیاد پر کچھ لکھنا آپ کے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ اس لیے عرصہ دراز تک اس سلسلے میں آپ نے کوئی تحریر شائع نہیں فرمائی اور نجی سوالات کے موقع پر اجمالی جوابات دیتے رہے۔ یہاں تک کہ وفات سے چند سال پہلے آپ نے مودودی صاحب کی کچھ کتابوں کا خود مطالعہ فرمایا اور اس موقع پر ان کے بارے میں اپنی جچی تلی رائے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرما دی' اور اسے "جواہر الفقہ" کا جز بنا دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو احتیاط و تثبت' عدل و انصاف' توازن و اعتدال

اور ہمدردی و دلسوزی حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی تنقیدی یا تردیدی تحریروں میں نظر آتی ہے' اس کا اصل سبب وہ للّٰہیت' بے نفسی' اور خدا ترسی ہے جو آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور اس کا لازمی ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ حق پسند طبیعتیں بات کو قبول کرتی ہیں' اور اگر کوئی قبول بھی نہ کرے تو اس سے مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار کا دروازہ نہیں کھلتا۔ چنانچہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کو جتنے مکاتب فکر سے اختلاف تھا' ان میں سے غالباً ہر ایک کے بارے میں تنقیدی مضامین یا رسالے آپ نے تحریر فرمائے ہیں' شیعہ صاحبان سے لے کر اہل حدیث حضرات تک کوئی بھی مکتب فکر ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں آپ کی کوئی تنقیدی تحریر موجود نہ ہو' لیکن یہ اسی للّٰہیت کا ثمرہ تھا کہ کسی بھی مکتب فکر سے مخاصمت کی فضا پیدا نہیں ہوئی' بلکہ ملت کے کسی اجتماعی کام میں جب مختلف مکاتب فکر کی مشترک جدوجہد کی ضرورت پیش آتی تو حضرت والد صاحبؒ ان حضرات میں سے تھے جن کی طرف اس بارے میں سب سے پہلے نگاہیں اٹھتی تھیں اور مخالف فرقے بھی عموماً اس بات کے معترف تھے کہ آپ نے جو کچھ کہا' اور لکھا ہے اس کا منشاء للّٰہیت کے سوا کچھ نہیں۔

اگر آج مسلمانوں کے تمام گروہ اور جماعتیں اس طریق کار کو اپنالیں تو امت کو افتراق اور انتشار کے اس عذاب سے نجات مل جائے جو اس کی اجتماعی فلاح کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

سیاست

حضرت والد صاحب قدس سرہ کا مزاج طبعی طور پر سیاسی نہیں تھا' اور نہ انہوں نے کبھی سیاست کو اپنا محور عمل بنایا' لیکن سیاست بھی دین کا ایک اہم شعبہ ہے' اور اس شعبے میں بھی مسلمانوں کی اجتماعی بہبود کی فکر ایک عالم دین اور داعئ حق کے فرائض میں شامل ہے' اس لئے جب کبھی مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہوئی تو آپ نے محدود مقاصد کے تحت اس شعبے میں بھی عظیم خدمات انجام دیں' لیکن اس انداز کے ساتھ کہ ان خدمات کے معروف ہونے کے باوجود آپ کبھی سیاسی شخصیت کی حیثیت سے معروف نہیں ہوئے۔

آپ کی زندگی میں چار مواقع ایسے آئے جب آپ نے سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیا' سب سے پہلے تحریک خلافت کے زمانے میں' دوسرے تحریک قیام پاکستان میں' تیسرے پاکستان کے قیام کے بعد یہاں اسلامی دستور نافذ کرنے کی جدوجہد میں' اور چوتھے ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے پہلے سوشلزم کی تردید میں۔

جہاں تک تحریک خلافت کا تعلق ہے' یہ آپ کی نوعمری کا زمانہ تھا' اور چونکہ آپ کو حضرت شیخ الہند قدس سرہ سے خصوصی تعلق تھا' اس لئے انہی کی سرپرستی میں انہی کے ایک معتقد و منتسب کی حیثیت سے آپ نے اس تحریک میں کام کیا' لیکن یہ کام بہت محدود بھی تھا اور نوعمری کی بناء پر اس دور کے تفصیلی حالات محفوظ نہیں رہ سکے۔

البتہ جب قیام پاکستان کے لیے ملک گیر تحریک شروع ہوئی تو یہ آپ کا عہد شباب تھا' اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی سرپرستی میں انہی کے ایماء کے مطابق آپ نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا جس کے قدرے مفصل حالات برادر مکرم و محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم اور جناب منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب کے مضامین میں مذکور ہیں۔

نیز قیام پاکستان کے بعد آپ آخر وقت تک یہاں اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کی عملی جدوجہد میں حصہ لیتے رہے' شروع کے تقریباً دس سال تو شب و روز اسی کوشش میں گزرے' بعد میں زیادہ توجہ تعلیمی اور تصنیفی مشاغل کی طرف ہوگئی' اور عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے' لیکن نفاذ اسلام کی کوششیں سیاست سے علیحدہ رہ کر بھی جاری رہیں۔
سیاست میں حضرت والد صاحبؒ کے مذاق کی جو خاص خاص باتیں احقر کی سمجھ میں آسکیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱ ۔ علماء اور سیاست

علماء کے لیے سیاست میں حصہ لینے کو حضرت والد صاحبؒ اس حد تک تو بہتر سمجھتے تھے کہ ملک میں اسلامی قوانین کے لئے جتنی جدوجہد ضروری ہو وہ کی جائے' لیکن اس سلسلے میں آپ دو باتوں پر بہت زور دیتے تھے :

۱ ۔ سب سے پہلی بات یہ کہ دینی تعلیمی اداروں کو سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے' ان

اداروں کے اساتذہ و طلباء کو ملک کے سیاسی حالات سے نظری طور پر واقف تو رہنا چاہیے، لیکن عملی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ اور جب کبھی کسی تعلیمی ادارے سے تعلق رکھنے والا کوئی عالم یہ محسوس کرے کہ اس کا عملی سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ پہلے اس ادارے سے مستعفی ہو جائے، اور پھر سیاسی خدمات انجام دے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اکابر علماء دیوبند کا طریقہ یہی رہا ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہنے کی حالت میں انہوں نے عملی سیاست میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا، لیکن جب حضرت شیخ الہند آزادی ہند کے سلسلے میں تحریکات خلافت میں مؤثر حصہ لینے لگے تو دارالعلوم دیوبند سے الگ ہو گئے۔ خود حضرت والد صاحبؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے بھی جب تحریک قیام پاکستان میں سرگرمی سے عملی حصہ لینا شروع کیا تو پہلے دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے، اس کے بعد عملی جدوجہد شروع کی۔

اس طرز عمل کی وجوہ بہت سی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب کوئی تعلیمی ادارہ خود یا اس کے اساتذہ و طلبہ عملی سیاست میں مشغول ہو جاتے ہیں تو وہ علمی انہماک مفقود ہو جاتا ہے جو تحصیل علم کے لیے ناگزیر ہے اور اس کی وجہ سے تعلیم و تعلّم کا معیار گر جاتا ہے اور استعدادیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ علم یکسوئی چاہتا ہے اور سیاسی مشاغل کو یکسوئی سے بیر ہے، چنانچہ جو لوگ زمانہ طالب علمی کے دوران عملی سیاست میں لگ جاتے ہیں عموماً ان کی استعداد ناقص رہ جاتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ علم و عمل کا صحیح مذاق پیدا کئے بغیر جب ناپختہ ذہن طلباء سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو وہ حدود قائم نہیں رکھ پاتے جو اسلام نے سیاسی جدوجہد کے لئے مقرر کی ہیں اور حدود کی مسلسل پامالی سے بالآخر دینی حلقوں کی سیاست بھی لادینی سیاست کے رخ پر پڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نیز پختہ دینی تربیت کے بغیر جب انسان سیاست کے خارزار میں داخل ہوتا ہے تو پندار و تعلّی، نام و نمود حب جاہ و منصب اور اسی طرح کی دوسری باطنی بیماریوں سے حفاظت بہت مشکل ہو جاتی ہے۔

تیسرے تقسیم کار کے اصول کا تقاضا بھی یہ ہے کہ تمام اہل علم سیاست ہی کے نہ ہو رہیں، بلکہ کچھ لوگ تعلیم و تعلّم اور خالص دعوت و ارشاد کے کام سے بھی وابستہ رہیں، تاکہ دینی ضرورت کے تمام کام توازن کے ساتھ چلتے رہیں، اور کسی شعبے میں کوئی خلا پیدا نہ ہو۔

چوتھے دینی مدارس کی صلاح و فلاح اس میں ہے کہ وہ نہ تو حکومت کے اتنے قریب ہوں کہ اس کے دست نگر ہو کر رہ جائیں، اور نہ حکومت سے ایسی مخاصمت قائم کریں کہ ان کے کام میں رکاوٹ پڑنے لگے، حکومتیں آئے دن بدلتی رہتی ہیں، لیکن ان اداروں کا کام ٹھوس، مثبت اور متواتر ہے۔ اس لئے حکومتوں کے قرب و بعد سے اس پر برا اثر نہ پڑنا چاہیے۔ ان کو ہر حالت میں اپنے دوررس تعمیری کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ اور یہ ادارے عملی سیاست میں داخل ہوں تو ان کی یہ حیثیت خطرے میں پڑسکتی ہے۔

۲ ۔ پھر جو اہل علم تعلیمی اداروں سے وابستہ نہ ہوں ان کے سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں بھی حضرت والد صاحب قدس سرہ کا رجحان اس طرف تھا کہ شدید ضرورت کے بغیر وہ الیکشن میں حصہ نہ لیں تو بہتر ہے، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ نے ایک مرتبہ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا : "ارباب اقتدار اس غلط فہمی کو ذہن سے نکال دیں کہ ملاّ اقتدار چاہتا ہے، میں واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم کبھی اقتدار میں آنا نہیں چاہتے، لیکن ارباب اقتدار کو "تھوڑا سا ملاّ" بنانا ضرور چاہتے ہیں۔"

حضرت علامہ عثمانیؒ اور حضرت والد صاحبؒ کے ذہن میں علماء کے سیاست میں حصہ لینے کا جو نقشہ تھا وہ یہ کہ ایک طرف تمام مکاتب فکر کے علماء متحد ہو کر ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے رائے عامہ کو ہموار کریں، اس کے لئے تقریر و تحریر اور علم و تحقیق کے جس کام کی ضرورت ہو اسے انجام دیں، یہاں تک کہ یہ عوامی مطالبہ ... محض ایک نعرے کی شکل میں نہیں، بلکہ ایک ٹھوس اور مثبت پروگرام کی شکل میں... اتنی قوت اختیار کر جائے کہ کسی بھی حکومت کو اس سے سرتابی کی جرأت نہ ہو۔ اور دوسری طرف وہ دیندار، سلیم الفکر اور مخلص افراد کی ایسی ٹیم تیار کریں جو الیکشن میں حصہ لے کر حکومت کے ایوانوں تک پہنچے اور اس عوامی مطالبے کو علماء کے زیر ہدایت عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے، چنانچہ جس زمانے میں "جمعیۃ علمائے اسلام" کی ذمہ داری حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ اور حضرت والد صاحبؒ وغیرہ کے پاس تھی، اس دور میں "نظام اسلام پارٹی" جمعیت ہی کی طرف سے اسی مقصد کے لئے قائم کی گئی تھی۔

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ سیاسی حکمت عملی جو ان حضرات نے اختیار فرمائی تھی، کامیاب نہیں ہو سکی، اور اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے، لیکن احقر کی ناقص

رائے میں اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حکمت عملی غلط تھی' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چند در چند وجوہ کی بناء پر سیاسی جدوجہد کا یہ نقشہ بروئے کار آہی نہیں سکا' ورنہ اگر یہ نقشہ اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ بروئے کار آتا تو غالباً اس کے نتائج آج کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوتے۔

بہر کیف! یہ الگ موضوع ہے کہ سیاسی جدوجہد کا یہ طریقہ صحیح اور مناسب تھا یا نہیں' لیکن یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا سیاسی مذاق کیا تھا اور وہ علماء کے لئے کس قسم کی سیاسی جدوجہد کو مفید اور مناسب خیال فرماتے تھے' حضرتؒ کو اپنی کسی رائے پر جمود کبھی نہیں ہوا' خاص طور پر سیاست کے بارے میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے طبعاً اس سے مناسبت نہیں' اس لئے بعض اوقات اپنے دوسرے اہل الرائے رفقاء کے احترام میں انہوں نے اپنی ذاتی رائے کو قربان بھی کردیا' لیکن ان کا اصلی مذاق وہی تھا جو اوپر عرض کیا گیا۔

۲ ۔ حکمرانوں کے ساتھ طرزِ عمل

حضرت والد صاحبؒ کے سیاسی مذاق کا دوسرا اہم جز یہ تھا کہ علماء کو حکومت اور حکمرانوں کے ساتھ کس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں آپ کی سوچی سمجھی رائے یہ تھی کہ علماء کو نہ تو حکمرانوں سے اتنا قرب اختیار کرنا چاہیے جس سے ان کے علمی وقار و استغناء پر آنچ آئے' یا حق گوئی میں رکاوٹ پیدا ہو' اور نہ ایسا بُعد رکھنا چاہیے کہ وہ ذاتی یا سیاسی خصومت کی شکل اختیار کرجائے' بلکہ علماء کا منصب ایک ایسے آزاد' مستغنی' مگر خیر خواہ ادارے کا ہونا چاہیے جو حکومت کے اچھے کاموں میں اس کے ساتھ تعاون بھی کرے' اور اس کے غلط کاموں پر ہمدردی و خیر خواہی اور حکمت و دل سوزی کے ساتھ تنقید و احتساب کا فریضہ بھی انجام دے۔

برصغیر میں انگریز کے دو سو سالہ عہد اقتدار کے دوران چونکہ مخلص اور باضمیر مسلمان ہمیشہ انگریز حکومت سے بیزار اور آزادی ہند کے لئے کوشاں رہے' اس لئے مسلمانوں کے سیاسی مزاج میں دو سو سال تک حکومت کی مخالفت کا رجحان غالب رہا۔ اور ہر اس تحریک کو قبول عام حاصل ہوا جو حکومت کی مخالفت میں اٹھی ہو' یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر حریت پسند مسلمانوں کی ہمدردیاں ہٹلر تک سے وابستہ ہوگئیں' کیونکہ اس کی طاقت

اور فتوحات کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ انگریز کی شوکت توڑنے اور اس کے جمے ہوئے اقتدار کو ڈھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شاید یہ اسی دو سو سالہ سیاسی مزاج کے باقی ماندہ اثرات ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد یہاں بھی منفی انداز سیاست پروان چڑھا، اور تقسیم سے پہلے کی طرح اب بھی حکومت کی ہر مخالفت نہ صرف قابل تعریف بلکہ بذات خود مقصد بن کر رہ گئی، اور جو شخص حکومت کے مقابلے میں جتنے زور اور جتنے تشدد سے سامنے آتا، عوام میں اسے اتنی ہی مقبولیت حاصل ہوتی۔ اس رجحان کو حکمرانوں کے اس طرز عمل سے بھی تقویت ملی جو واقعۃً قابل مخالفت تھا، لیکن بہرحال! واقعہ یہی ہوا کہ ہماری سیاست میں منفی انداز فکر ترقی کرتا چلا گیا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد ہماری سیاسی حکمت عملی بھی تبدیلی کی محتاج تھی، اب انگریزی دور کی طرح حکومت کی مخالفت بذات خود مقصد نہ بنی چاہیے تھی، بلکہ ہر مرحلے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ ملک و ملت کے استحکام اور اسلامی طرز حیات کے فروغ کے لئے کونسا طرز عمل مفید ہوگا؟ اس طرز فکر کے نتیجے میں جہاں بعض مواقع پر حکومت کے مقابلے میں ڈٹ جانا مفید ہوتا، وہاں بعض مواقع پر اس کی حوصلہ افزائی اور اس کے قریب پہنچنا بھی زیادہ سودمند ثابت ہوتا چنانچہ ملکی سیاست میں کئی مراحل ایسے بھی آئے کہ جن میں حکومت سے سیاسی مخاصمت کی فضا پیدا کرنے کے بجائے اس کے ساتھ باوقار تعاون اور اسے دور دور سے برا کہنے کے بجائے قریب جاکر اصلاح کی فکر شاید ملک و ملت کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتی۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے اسی مخلصانہ فکر کے ساتھ ملکی سیاست میں حصہ لیا تھا، چنانچہ پاکستان میں ان کی مختصر سی سیاسی زندگی میں حکومت کے ساتھ تعاون اور اس کی مخالفت دونوں کی متوازن مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اس دور میں جو جماعتیں ملک کے سیاسی منظر پر زیادہ نمایاں تھیں وہ بدستور "اقتدار چھوڑو" کی اسی سیاست پر عمل پیرا رہیں جو تقسیم ہند سے پہلے کی سیاست تھی۔ بلکہ بعض حضرات کی طرف سے حضرت علامہ عثمانیؒ اور ان کے رفقاء کے طرزِ عمل پر یہ اعتراضات بھی ہوئے کہ وہ جرأت و عزیمت اور بیباکی و شجاعت سے محروم ہے، اور حضرت والد صاحبؒ سنایا کرتے تھے کہ ایک ایسے ہی اعتراض کے جواب میں حضرت علامہ عثمانی قدس سرہ نے فرمایا تھا: "اگر دل میں

اخلاص ہو تو بعض اوقات حکومت کے قید خانے برداشت کرنے کے مقابلے میں عوام کی کالی جھنڈیوں کو برداشت کرنا زیادہ جرأت و عزیمت چاہتا ہے' اور جس طرح قید و بند سے ڈر کر اپنے صحیح طرز عمل کو بدل لینا بزدلی' اور مداہنت ہے اسی طرح کالی جھنڈیوں سے ڈر کر اپنے ضمیر کی آواز کو دبا لینا بھی بدترین مداہنت ہے۔ اس میں اگر حکومت کی خوشامد یا رضا مطلوب ہے تو اس میں عوام کو خوش کر کے ہیرو بننا مقصود ہے' اور اللہ کو راضی کرنے کی فکر دونوں میں نہیں۔"

البتہ اس طرز عمل کا لازمی جزئیہ ہے کہ حکومت کے قرب کو ایک تو سہل نگاری یا عافیت کوشی کی بنا پر نہیں بلکہ دینی ضرورت کے تحت اختیار کیا جائے' چنانچہ جہاں ضرورت داعی ہو وہاں حق گوئی سے ادنیٰ باک نہ ہو اور دوسری طرف اس قرب کو خالصتاً بوجہ اللہ اختیار کیا جائے اور اس میں ذاتی مفادات کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو' کیونکہ وہ دنیا و آخرت دونوں کی تباہی ہے' اور ایسے قربْ سے بُعد ہزار درجہ بہتر ہے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ کا حکمرانوں کے ساتھ جو طرز عمل رہا وہ ان تمام حدود کی رعایت سے عبارت تھا آپ نے کبھی کسی حکمران کے سامنے مداہنت سے کام نہیں لیا' اور ضرورت کے مواقع پر سخت سے سخت بات کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا' لیکن ساتھ ہی آپ نے مخالفت برائے مخالفت کے بجائے ضرورت کے وقت حکومت سے تعاون اور اچھے کاموں میں اس کی حوصلہ افزائی میں بھی بخل کا مظاہرہ نہیں فرمایا۔ آپ دینی مقاصد کے تحت متعدد حکمرانوں سے قریب بھی رہے' اور اسی مقصد کے تحت آپ کو بعض حکومتوں کے زیر عتاب بھی رہنا پڑا۔ ایک طرف آپ کے وقار و استغناء اور دوسری طرف للّٰہیت اور ہمدردی و دلسوزی کی وجہ سے حکمرانوں پر یہ بات واضح رہی کہ آپ کو نہ خریدا جا سکتا ہے' نہ ضمیر کے خلاف کسی قول و فعل پر آمادہ کیا جا سکتا ہے' اور نہ کسی معاملے میں آپ کی حمایت کو تملّق یا مخالفت کو عناد پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

جس زمانے میں آپ بورڈ تعلیمات اسلام کے رکن تھے' اس دور میں آپ نے ایک دینی ضرورت کے تحت حکومت کے خلاف ایک اخباری بیان دے دیا۔ اس پر ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار نے آپ سے کہا کہ "مفتی صاحب! آپ نے بورڈ کا ممبر ہوتے ہوئے ایسا بیان دیا' حالانکہ یہ بورڈ حکومت ہی کا قائم کردہ ہے۔" اس پر حضرت والد صاحبؒ نے

فرمایا : ''اول تو بورڈ کے ارکان حکومت کے ملازم نہیں اور اگر ملازم بھی ہوں تو یہ ملازمت شاید ان حضرات کے لئے تو حق گوئی میں رکاوٹ بن سکتی ہو جن کا ایک سوٹ کم از کم دو سو روپے میں بنتا ہے' اور جوتے' ٹوپی پر مزید سو روپے خرچ ہوتے ہیں' ان کے برخلاف میرا معاملہ یہ ہے کہ بحمد اللہ سر سے لے کر پاؤں تک میرے لباس کی تیاری پر بمشکل پندرہ بیس روپے خرچ ہوتے ہیں' اس لئے کوئی ملازمت میرے لئے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ رہا بورڈ کی رکنیت کا معاملہ تو شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں بفضلہ تعالیٰ اس عہدے سے استعفاء جیب میں لئے پھرتا ہوں' جب یہ رکنیت کسی دینی ضرورت کی انجام دہی میں رکاوٹ ثابت ہوگی تو انشاء اللہ استعفاء دینے کے لئے چند منٹ بھی درکار نہیں ہوں گے۔''

حکمرانوں سے ملاقات یا ان سے میل جول بڑھانے کی باقاعدہ کوشش کرنا آپ کو بالطبع ناپسند تھا' جہاں کوئی دینی فائدہ نظر آتا وہاں بقدر ضرورت ملاقاتیں کرتے' لیکن جہاں ان ملاقاتوں سے کوئی دینی فائدہ متصور نہ ہوتا وہاں حتی الامکان اس سے پرہیز ہی فرماتے۔ ایک مرتبہ مشرقی پاکستان کے ایک بڑے دینی مدرسے کا جلسہ تھا جس کے مہتمم صاحب سے حضرت والد صاحبؒ کے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے' اس جلسے میں انہوں نے اس وقت کے صدر مملکت کو بھی مدعو کیا تھا' اتفاق سے اس وقت کے سربراہ مملکت ایک ایسے صاحب تھے جن سے حضرت والد صاحبؒ کو دینی معاملات میں کسی خیر کی توقع نہ تھی' اس لئے آپ نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ مجھے ان صاحب سے کبھی ملاقات نہیں کرنی' جب جلسے کا دن آیا اور صدر صاحب کی آمد آمد ہوئی تو حضرت والد صاحبؒ نے مدرسے کے مہتمم صاحب سے فرمایا کہ ''میں ان صاحب سے نہ ملنا چاہتا ہوں' نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ ان سے میرا سامنا ہو' اس لئے آپ مجھے کوئی ایسا کمرہ بتا دیجئے جہاں میں سو جاؤں۔'' انہوں نے ایک کمرہ حضرت والد صاحبؒ کے لئے مخصوص کردیا' اور آپ وہاں سو گئے۔ جب صدر صاحب تشریف لائے اور انہیں مدرسے کا معائنہ کرایا گیا تو معائنے کے دوران مہتمم صاحب انہیں اس کمرے پر بھی لائے' اور اندر اشارہ کرکے فرمایا : ''اس میں مفتی محمد شفیع صاحب سو رہے ہیں۔''

صدر صاحب سے ملاقات کے بعد جب مہتمم صاحب نے حضرت والد صاحبؒ سے اس واقعے کا تذکرہ فرمایا تو آپ نے کہا : ''اگرچہ میں نے آپ سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ آپ انہیں میری اس انداز سے موجودگی جتائیں' لیکن یہ اچھا ہوا' انہیں معلوم تو ہوا کہ

ملک میں ایسے "کج دماغ لوگ" بھی موجود ہیں۔"

حکمرانوں سے اس استغناء کے اس انداز کے باوجود ہر حکومت کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ رہا کہ آپ نے اس کی غلطیوں پر تنقید کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح اور اچھے کاموں پر حوصلہ افزائی میں کبھی اپنی انا کو آڑ نہیں بننے دیا' ان کے اچھے کاموں کی کھلے دل سے تعریف کی' اور جن حکمرانوں سے خیر کی توقع تھی ان سے ملاقاتیں کر کرکے ان سے ایسے کام کرائے جو ملک وملت کے لئے مفید تھے' البتہ ان تعلقات میں اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا کہ وہ کسی ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہ بنیں۔ چنانچہ متعدد مواقع پر آپ کو اعلیٰ سرکاری حکام کی طرف سے ذاتی مفاد کی پیش کش ہوئی' لیکن آپ نے اسے خوبصورتی کے ساتھ رد فرمادیا۔

آپ کی اسی للّٰہیت' اخلاص' اور سلامت فکر کا ثمرہ تھا کہ سرکاری حکام اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ آپ سے زور و زر کے ذریعے کوئی ناجائز مطلب برآری کی جاسکتی ہے۔ ایک مرتبہ کراچی میں علماء کا ایک اجتماع ہونے والا تھا جو حکومت کے منشاء کے خلاف تھا۔ چنانچہ ایک سرکاری عہدہ دار نے کراچی کے علماء کو فرداً فرداً بلا کر اس اجتماع میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی' بعض علماء سے ان کی جو گفتگو ہوئی اس کا علم حضرت والد صاحبؒ کو بھی ہوچکا تھا۔ اسی دوران انہوں نے آپ کو بھی ملاقات کے لیے بلایا۔ والد صاحبؒ اسی خیال سے تشریف لے گئے تھے کہ اسی موضوع پر بات چیت ہوگی۔ لیکن جب آپ وہاں جاکر بیٹھے تو انہوں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں' والد صاحبؒ نے پوچھا بھی کہ بلانے کا مقصد کیا تھا؟ لیکن انہوں نے کہا "جی ہاں! ابھی عرض کروں گا۔" اور پھر کوئی دوسری غیر متعلق بات شروع کردی' والد صاحبؒ نے پھر پوچھا کہ بات کیا تھی؟ انہوں نے پھر ٹلادیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے' آخر جب تیسری بار والد صاحب نے اصرار فرمایا تو اتنا بول سکے :۔

"یہ فرمایئے کہ شہر کا کیا حال ہے؟"

حضرت والد صاحب نے برجستہ فرمایا :

"بہت برا حال ہے"

"کیوں؟" انہوں نے پوچھا

حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا : "اس لئے کہ جس ملک کے عوام کو حکومت پر اعتماد

نہ ہو اس ملک کا حال کبھی اچھا نہیں ہو سکتا اور پھر اس عدم اعتماد کی وجوہ بیان فرمائیں۔

غرض ان صاحب کو آخر تک اصل مطلب کی بات کہنے کی جرأت نہ ہو سکی، یہاں تک کہ چلتے وقت حضرت والد صاحبؒ نے پھر پوچھا کہ "مجھے ابھی تک اپنے یہاں آنے کا مقصد معلوم نہیں ہو سکا۔" اس پر انہوں نے فرمایا "دیر کافی ہو گئی ہے، انشاء اللہ پھر کبھی آپ سے عرض کروں گا۔" اس سارے مکالمے اور پوری ملاقات کو "نصرت بالرعب" کی کرامت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ جو انبیاء علیہم السلام کے صدقے میں وارثان نبیؐ کو بھی عطا ہوتی ہے۔

حکومت کے حلقوں سے میل جول کے دوران حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ اپنے طرز اور وضع پر مضبوطی سے قائم رہے، اور یہ اختلاط معمولی معمولی باتوں میں کبھی آپ کے طرز میں ادنیٰ تبدیلی پیدا نہ کر سکا، سرکاری اجتماعات اور تقریبات میں گروپ فوٹو اجتماعات کا لازمی حصہ بن کر رہ گیا ہے لیکن حضرت والد صاحبؒ ہمیشہ ایسے موقع پر الگ ہو جاتے، شروع شروع میں بعض ناواقف لوگوں نے شمولیت پر اصرار بھی کیا، لیکن جب حضرت والد صاحبؒ نے فرمادیا کہ : "میں اسے شرعاً ناجائز سمجھتا ہوں۔" تو پھر لوگوں نے کہنا ہی چھوڑ دیا، بلکہ مزاج شناس حکام آپ کی موجودگی میں گروپ فوٹو کھنچوانے سے کترانے لگے۔

سرکاری تقریبات میں کھڑے ہو کر کھانے کی بدمذاقی شروع سے جاری ہے، حضرت والد صاحبؒ ایسی تقریبات میں ہمیشہ اپنا مختصر سا کھانا پلیٹ میں نکال کر دور کسی جگہ جا بیٹھتے اور وہاں بیٹھ کر تناول فرماتے۔ ایک مرتبہ شہید ملت لیاقت علی خاں صاحب مرحوم کی طرف سے دعوت تھی اور وہاں کھڑے ہو کر کھانے کا انتظام تھا جسے حضرت والد صاحبؒ "کھڑا کھیل" فرمایا کرتے تھے، حضرت والد صاحبؒ حسب معمول اپنا کھانا لے کر کہیں جا بیٹھے، آپ کو دیکھ کر بعض دوسرے حضرات بھی وہیں آگئے، یہاں تک کہ وہ ایک محفل سی بن گئی۔ لیاقت علی خاں صاحب مرحوم دعوت میں عام مہمانوں کے ساتھ مصروف تھے، کھانے کے اختتام پر وہ حضرت والد صاحبؒ کے پاس آئے اور کہنے لگے :

سلسلہ جاری رہا، اس زمانے تک آپ ان تمام سیاسی معاملات پر نظر رکھتے جو ملک کے دینی مستقبل پر اثر انداز ہو سکتے تھے، اور پھر ان کے بارے میں مختلف زاویوں سے کوشش بھی فرماتے لیکن ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد سے آپ نے اپنی سیاسی جدوجہد کو بہت مختصر کر کے زیادہ توجہ تعلیمی اور تصنیفی کاموں پر صرف کرنی شروع کر دی، اور ملک کے سیاسی مسائل میں صرف اس وقت کوئی عملی حصہ لیا جب دینی اعتبار سے وہ ناگزیر ہو گیا۔

صدر ایوب خاں مرحوم کے زمانے میں تجدد کی جو تحریکیں سرکاری سرپرستی میں پروان چڑھیں، اور "ادارہ تحقیقات اسلامی" کی طرف سے اسلام پر جو مشق ستم ہوئی اس سے حضرت والد صاحبؒ سخت نالاں تھے، اور وقتاً فوقتاً اپنے مضامین، مقالات، اخباری بیانات اور خطوط کے ذریعے اس کی مؤثر تردید بھی فرماتے رہے۔ ان میں سے بہت سی تحریریں متعلقہ مسائل پر ہمارا بیش قیمت علمی سرمایہ بن کر آج تک محفوظ ہیں۔ "عائلی قوانین پر تبصرہ"، "ضبط ولادت"، "رؤیت ہلال"، "اسلامی ذبیحہ"، "مسئلہ سود"، "قرآن میں نظام زکوٰۃ"، "اسلام کا نظام تقسیم دولت" اور "بیمۂ زندگی" وغیرہ اسی زمانے کی یادگاریں ہیں جو اپنے اپنے موضوع پر بعد کے مصنفین کے لئے ماخذ کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔

البتہ علمی کاموں کے علاوہ دو کام ایسے تھے جو آپ نے اس دوران بھی اہتمام کے ساتھ جاری رکھے ایک یہ کہ جو دینی جماعتیں میدان سیاست میں سرگرم ہیں ان کو متحد کرنے کی کوشش، اور دوسرے وقتاً فوقتاً دینی معاملات میں حکام وقت کو تبلیغ و نصیحت۔ اس زمانے میں جب کوئی شخص آپ سے دوبارہ سرگرم سیاسی جدوجہد کا مطالبہ کرتا تو آپ یہ فرماتے کہ "اب میری عمر کا آخری زمانہ ہے، قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں اور علالت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، میں عمر کے قیمتی دس سال ملکی معاملات کے لئے خرچ کر چکا ہوں، اب ان بکھیڑوں میں پڑنے کے بجائے صرف وہ کام کرنا چاہتا ہوں جن کا دینی فائدہ واضح اور یقینی ہو۔ اس لیے اب تعلیم و تصنیف کی راہ سے دین کی جو خدمت بن پڑے گی انجام دوں گا، اور سیاسی جدوجہد میں دوبارہ حصہ صرف اس وقت لے سکتا ہوں، جب سیاسی جماعتیں مل کر براہ راست اسلام کے نفاذ کے لئے کوئی مؤثر تحریک شروع کریں، جمہوریت اور دوسرے سیاسی مسائل کے جھنجھٹ میں مبتلا ہونے کے لئے میں اپنی یہ مصروفیات نہیں چھوڑ سکتا۔

چنانچہ جب سابق وزیر اعظم پاکستان حسین شہید سہروردی مرحوم نے فیلڈ مارشل

ایوب خاں صاحب مرحوم کے خلاف تحریک جمہوریت کا آغاز کیا اور اس غرض کے لئے تمام پرانے سیاست دانوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا تو ایک روز حضرت والد صاحب قدس سرہ کو فون کیا اور کہا : ''مفتی صاحب! پچھلے سالوں میں بہت سے مسائل میں ہمارا آپ کا اختلاف رہا' لیکن اب میں جمہوریت کی بحالی کے لئے ملک گیر تحریک اٹھا رہا ہوں' ظاہر ہے کہ بحالیٔ جمہوریت کے مقصد سے تو آپ کو بھی اتفاق ہو گا' اس لئے اس کام میں آپ بھی ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں۔''

والد صاحبؒ نے فرمایا : ''سہروردی صاحب! بات یہ ہے کہ میں ملّا آدمی ہوں' اور جمہوریت وغیرہ کو کچھ نہیں جانتا' میں صرف اسلام کو جانتا ہوں۔''

سہروردی صاحب نے کہا۔ ''مگر اسلام نے بھی تو جمہوریت کی تعلیم دی ہے۔''

والد صاحبؒ نے فرمایا۔ ''بات یہ ہے کہ اسلام کے بغیر میں کسی جمہوریت کا قائل نہیں' اور جتنی جمہوریت اسلام میں ہے وہ اسلام کے ضمن میں خود بخود آجائے گی' اس لئے جمہوریت کے نام پر کسی تحریک میں شمولیت میرے لئے ممکن نہیں' ہاں اگر آپ اسلام کے نفاذ کے لئے صدق دل سے کوئی تحریک چلائیں تو اس میں آپ کا ساتھ دوں گا۔''

اس جواب پر سہروردی صاحب خاموش ہو گئے' اور رسمی گفتگو کے بعد فون بند کر دیا۔

حضرت والد صاحبؒ نے سہروردی صاحب کو جو جواب دیا وہ آپ کا سوچا سمجھا نظریہ تھا' آپ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے نفاذ کے لئے جمہوریت کو زینہ بنانے کا تصور ہی سرے سے غلط ہے' اول تو مغربی طرز کی جمہوریت بذات خود اسلام کے خلاف ہے' دوسرے ''پہلے جمہوریت پھر اسلام'' کے نسخے سے سب سے زیادہ نقصان اسلام کو پہنچے گا' کیونکہ موجودہ سیاسی شعور کے ساتھ صحیح صحیح جمہوریت قائم ہونے کے لئے عمریں چاہئیں' اور اگر اس وقت تک اسلام کو روبکار لانے کے لئے کوئی مؤثر اقدام نہ کیا گیا تو وہ لادینی طاقتیں جو مسلسل دلوں سے اسلام کو کھرچنے میں مصروف ہیں اس وقت تک ایسی فضا تیار کر دیں گی کہ اس میں اسلام کا نفاذ ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہو کر رہ جائے' اور کچھ بعید نہیں ہے کہ ''جمہور'' کو آزادیٔ تحریر و تقریر اور آزادی انتخاب ملنے تک ''جمہور'' کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو چکی ہو کہ وہ خود نفاذِ اسلام کے نام ہی سے کترانے لگیں۔ اس لئے حضرت والد صاحبؒ کا خیال تھا کہ ''پہلے جمہوریت' پھر اسلام'' کے فارمولے کا نتیجہ اسلام سے دست برداری

کے سوا کچھ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت والد صاحبؒ تبدیلی اقتدار اور بحالی جمہوریت وغیرہ کی تحریکوں کے بجائے اس بات کے خواہاں رہے کہ کوئی مؤثر تحریک صرف اسلام کے نام پر چلے اور اس میں اسلام کے نام کو محض تبدیلیٔ اقتدار کے بہانے کے طور پر استعمال نہ کیا جائے' بلکہ اس کا اول و آخر مقصد نفاذ اسلام ہو اور وہ حکمرانوں کو اس مقصد کے لئے عملی اقدامات پر مجبور کردے۔ چنانچہ جب صدر ایوب خاں صاحب مرحوم کے آخری دور حکومت میں ان کے خلاف تحریک چلی تو حضرت والد صاحبؒ کو اس بات کا صدمہ تھا کہ اس کا براہ راست مقصد سوائے تبدیلیٔ اقتدار اور "بحالی جمہوریت" کے کچھ نہیں ہے اور آپ کا اندازہ یہ تھا کہ اس کے نتیجے میں شاید تبدیلی اقتدار تو عمل میں آجائے' لیکن "بحالی جمہوریت" کی جس منزل کا ملکی سیاست میں چرچا ہے' نہ وہ حاصل ہو سکے گی اور نہ نفاذ اسلام کی کوشش کا نمبر آسکے گا' اس لئے اس وقت بھی آپ کی رائے یہ تھی کہ تبدیلی اقتدار کو مقصد بنانے کے بجائے نفاذ اسلام اور استحکام ملک سے متعلق کچھ معین مطالبات کو مقصد بنایا جائے' چنانچہ آپ نے اس بارے میں متعدد سیاسی رہنماؤں سے گفتگو بھی فرمائی' انہیں خطوط بھی لکھے' اور برادر مکرم جناب مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم کو اپنا پیغام دے کر مختلف سیاسی جماعتوں کے پاس بھی بھیجا اور مجھے یاد ہے کہ حضرت والد صاحبؒ اس دوران بستر علالت پر تھے تو ملک کی ایک سیاسی جماعت کے سربراہ ملاقات کے لئے تشریف لائے' آپ نے فرمایا :

"موجودہ تحریک کے نتیجے میں آپ اقتدار کی تبدیلی میں تو کامیاب ہو جائیں گے' لیکن کیا کوئی ایسا متبادل اقتدار آپ کے پاس موجود ہے جو دینی اعتبار سے بہتر ہو۔"

انہوں نے جواب میں فرمایا : "اس وقت تو سب سے بڑا مسئلہ اس آمرانہ اقتدار کا بت توڑنا ہے' جب ہم یہ مقصد حاصل کرلیں گے تو کوئی نہ کوئی بہتر صورت نکلے گی۔"

اگرچہ ان کے پاس اس سوال کا کوئی مثبت جواب نہیں تھا' لیکن اس وقت ملک کی سیاسی فضا ایسی بن چکی تھی کہ تبدیلی اقتدار بذات خود ایک مقدس مقصد بن گیا تھا' اور تحریک کا رخ کسی مثبت مقصد کی طرف موڑنے کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ ہوا وہی جس کا والد صاحب کو خطرہ تھا کہ اقتدار تو تبدیل ہو گیا' مگر نہ بحالی جمہوریت کی مزعومہ منزل حاصل ہوئی'

نہ اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی بہتری پیدا ہوئی' بلکہ ملک اپنی سالمیت اور استحکام کے اعتبار سے نہ صرف برسوں پیچھے چلا گیا' بلکہ بالآخر دو نیم ہو کر رہا۔

بہرکیف! کہنا یہ تھا کہ اس دور میں حضرت والد صاحب سرگرم سیاسی جدوجہد سے کنارہ کش ہو چلے تھے' لیکن ناگزیر مواقع پر حکومت اور سیاسی جماعتوں دونوں کو ملک و ملت سے متعلق اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ ضرور فرماتے رہے۔

حضرت والد صاحب کا معمول تھا کہ جن حکمرانوں کے بارے میں آپ کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ہزار علمی اور فکری غلطیوں کے باوجود اسلام دشمن نہیں ہیں' ان کو خاص خاص مواقع پر دینی معاملات سے متعلق خطوط تحریر فرمادیتے تھے' یہ خطوط عموماً تبلیغی انداز کے ہوتے' اور ان میں آپ نہایت شائستگی کے ساتھ مخاطب حکمران کی بنیادی فکری اور عملی غلطیاں واضح فرمادیتے تھے' اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگ چونکہ اپنی زندگی میں دین اور اہل دین سے دور رہے ہیں' اس لئے ہمارا فرض ہے کہ دین کی ضروری باتیں تبلیغی انداز میں ان تک پہنچائیں۔

حضرت والد صاحب کا یہ معمول در حقیقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی ایک ہدایت کے مطابق تھا' جب حضرت تھانوی قدس سرہ نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کی حمایت کا فیصلہ فرمایا تو اس فیصلے کے ساتھ ساتھ علماء کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ باقاعدہ مقصد بنا کر مسلم لیگ کے رہنماؤں سے تبلیغی ملاقاتیں کرتے رہیں' اور انہیں دینی تقاضوں کے مطابق عمل کی متواتر تلقین جاری رکھیں' چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس کے بعد قائداعظم محمد علی جناح صاحب کے پاس علماء کے کئی وفود روانہ فرمائے جن میں سے ایک میں حضرت والد صاحب قدس سرہ بھی شامل تھے۔ آپ اپنے شیخ کی اس ہدایت پر آخر تک کاربند رہے۔ ۵۸ء کے بعد چونکہ آپ کی مصروفیات دارالعلوم اور اس کے ذریعے مختلف تعلیمی و تبلیغی امور کی انجام دہی میں سمٹ گئی تھیں' اور دارالحکومت اسلام آباد منتقل ہو جانے کی بنا پر آپ کے لئے ملاقاتوں کا اہتمام ممکن نہ رہا تھا' اس لئے ملاقاتوں کے بجائے آپ نے ضرورت کے مواقع پر خطوط لکھ کر اس ہدایت کی تعمیل فرمائی۔ ان میں سے ایک مکتوب جو عائلی قوانین سے متعلق صدر ایوب صاحب کو لکھا گیا تھا' آپ کی کتاب "عائلی قوانین پر مختصر تبصرہ" میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

ان خطوط کا کوئی فوری فائدہ ظاہر ہو یا نہ ہو، لیکن حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ داعی کا کام بات پہنچانا ہے، اور اگر صحیح بات، صحیح نیت اور طریقے سے پہنچائی جائے تو کسی نہ کسی صورت میں وہ مؤثر ضرور ہوتی ہے، اور اس کا ادنیٰ فائدہ یہ ہے کہ اپنا ایک دینی فریضہ ادا ہو جاتا ہے، تبلیغی ملاقاتیں ہوں یا خطوط، یہ حکومت کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرنے کے منافی نہیں، بلکہ ایک راستہ یہ بھی ہے کہ جسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت والد صاحبؒ کے تبلیغی خطوط کا سلسلہ صرف پاکستان تک محدود نہیں رہا، بلکہ ۱۹۶۴ء میں جب آپ حج کے لئے تشریف لے گئے، برادرم محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم اور یہ ناکارہ بھی ہم سفر تھے، تو وہاں بہت سے ایسے منکرات سامنے آئے جنہیں دیکھ کر آپ کا دل دکھا، اس موقع پر آپ نے ایک مفصل یادداشت شاہ فیصل مرحوم اور وہاں کے دیگر ذمہ داروں کو پیش کی جو بعد میں شائع بھی ہوئی۔

اخلاق و عادات اور معاملات

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج و مذاق کے بیان میں اخلاق و عادات اور معاملات و معاشرت ایسے موضوع ہیں جن پر کچھ لکھنا مجھے ہمیشہ بہت مشکل نظر آیا ہے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس بارے میں آپ کے مزاج و مذاق کو کماحقہ بیان کرنے سے میں اپنے آپ کو بالکل عاجز پاتا ہوں، یہاں "معاملات" سے میری مراد صرف بیع و شراء وغیرہ کے معاملات یا مالی امور نہیں ہیں، بلکہ ہر وہ کام ہے جس میں انسان کو کسی دوسرے سے واسطہ پڑتا ہو، حقوق العباد کی ادائیگی، دوست دشمن کے ساتھ تعلقات کی نوعیت، مخالفت و حمایت کی حدود، مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں طرز عمل، نرمی و سختی کے مواقع، مختلف حقوق و فرائض میں توازن اور ان کی حدود کی رعایت، یہ ساری باتیں "معاملات" میں داخل ہیں، اس وسیع مفہوم کے تحت خوش اخلاقی "معاملات کی سلامتی" اور "معاشرت کی خوبی" کہنے کو تو بہت مختصر اور آسان الفاظ ہیں، لیکن جب انسان، فکر و بصیرت کے ساتھ ان الفاظ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عام تعلقات میں داخل ہوتا ہے، اور اس کے جزوی واقعات سامنے آکر متعارض تقاضے ابھرتے ہیں تو جگر، خون اور پتہ پانی ہوتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ

زندگی کے اس پہلو کی مشکلات کا اندازہ بھی اسی کو ہو سکتا ہے جس نے اس نقطۂ نظر سے اپنی زندگی کو متوازن بنانے کی کوشش کی ہو' معاملات اور معاشرت کی درستی کے لئے نہ تنہا کوئی کتاب انسان کی مدد کر سکتی ہے' نہ کوئی نظری فلسفہ معاون ہو سکتا ہے' اس کا تو ظاہری اسباب میں ایک ہی طریقہ ہے' اور وہ یہ کہ انسان عرصہ دراز تک کسی متبع سنت اور صاحب بصیرت شیخ کامل کی صحبت میں رہ کر ان معاملات کی تربیت لے۔ اور حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ صرف ایسے شیخ کامل کی صحبت میں جا بیٹھنا' اس کے ملفوظات و مواعظ سن لینا اور اس کے بتائے ہوئے اوراد و اشغال پر عمل کر لینا بھی اس کے لئے کافی نہیں' بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان طرز معاشرت اور درستی معاملات کا انداز سیکھنے کی نیت سے اپنے شیخ کے طرز عمل کا بغور مشاہدہ کرے' اور خود اپنی زندگی کے معاملات اس کے سامنے پیش کر کے اس سے ہدایات حاصل کرے۔ تب جا کر اس معاملے میں ایسا مذاق پیدا ہوتا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی صحیح رہنمائی کر سکے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے سلوک و طریقت میں جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا' اس کا ایک اہم حصہ معاملات اور معاشرت کی تعلیم و تربیت تھی۔ اس حقیقت سے کسی بھی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ معاملات اور معاشرت دین کا اہم جزء ہیں' چنانچہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی جو تربیت فرمائی اس میں عقائد' عبادات اور اخلاق وغیرہ کے علاوہ معاملات و معاشرت کی مفصل تربیت بھی شامل ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں اور اس کے بعد بھی بیعت و ارشاد کے سلسلے میں صرف اوراد و اشغال کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی' بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مسترشد کو اتباع سنت کی تربیت کا اہتمام ہوتا تھا جس میں معاملات و معاشرت کی تربیت بھی داخل تھی' لیکن پھر رفتہ رفتہ اس پہلو پر زور کم ہوتا گیا' یہاں تک کہ لوگ دین کو صرف عبادات اور تصوف کو صرف اوراد و اشغال میں منحصر سمجھنے لگے' اور آخر زمانے میں تو یہ حالت ہو گئی کہ مسترشد کو ذکر و شغل کے چند مراحل طے کرانے اور مصنوعی ذرائع سے قلب و نظر میں کچھ کیفیات پیدا کرانے کے بعد یہ باور کرایا جانے لگا کہ سلوک و طریقت کا مقصد حاصل ہو گیا' خواہ اس کے معاملات کتنے فاسد' اخلاق کتنے خراب اور معاشرت کتنی مردم آزار ہو۔

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس طریق میں یہ تجدیدی کارنامہ انجام دیا

کہ جو لوگ آپ سے اصلاح کا تعلق قائم کرتے انہیں دین کے تمام شعبوں کی متوازن تربیت دیتے' اور چونکہ معاملات و معاشرت کو لوگوں نے دین سے بالکل ہی خارج سمجھ لیا تھا اس لئے ان کی اصلاح پر زیادہ توجہ مرکوز فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت ؒ کے متوسلین میں معاملات کی صفائی اور حسن معاشرت کا وصف ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے۔

یوں تو جتنے حضرات خانقاہ تھانہ بھون سے فیض یاب ہوئے ان سب نے اپنے شیخؒ کا یہ رنگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق اپنایا' لیکن اس سلسلے میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اول تو آپ کو حضرت ؒ کے ساتھ معاملات بہت پیش آئے' جوہر شناس شیخ نے اپنے اس گوہر قابل کو ہر لحاظ سے جلا بخشنے کے لئے اس سے ہر طرح کے کام لئے' اور اپنی گوناں گوں مصروفیات میں سے تقریباً ہر ایک میں شریک یا کم از کم اس سے باخبر رکھا' مسلمانوں کے اجتماعی مسائل ہوں یا مخالفین کے ساتھ برتاؤ' حکومت و سیاست سے متعلق معاملات ہوں' یا کتابوں کی نشر و اشاعت وغیرہ کے قضیے' علمی مسائل کی تحقیق ہو یا تصنیف و تالیف' گھریلو معاملات ہوں یا رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ تعلق کے مسائل' حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے ان تمام چیزوں میں آپ کو اپنے مشوروں میں شریک رکھا جس کا اصل مقصد ان تمام معاملات کی تربیت تھی۔

دوسری طرف حضرت والد صاحبؒ نے اپنے شیخ کو جو مکاتیب لکھے ہیں' ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ والد صاحبؒ کی زندگی کا کوئی قابل ذکر معاملہ ایسا نہیں تھا جو آپ نے حضرتؒ کی خدمت میں پیش کرکے آپ سے ہدایت طلب نہ فرمائی ہو' بلکہ ان مکاتیب میں اذکار و اشغال کی تلقین اور باطنی کیفیات کے مقابلے میں معاملات و معاشرت سے متعلق سوالات کہیں زیادہ ہیں اور ان سوالات کے جواب میں حضرتؒ کی طرف سے مفصل ہدایات موجود ہیں۔ "اشرف المکاتیب" یا "مکاتیب حکیم الامت" کے نام سے جو خطوط البلاغ میں سلسلہ وار شائع ہو رہے ہیں' وہ اصل مکاتیب کا نصف سے بھی کم حصہ ہیں' اور وجہ یہی ہے کہ نصف سے زائد مکاتیب گھریلو معاملات' مختلف' اشخاص کے ساتھ طرز عمل اور اس قسم کے نجی امور پر مشتمل ہیں جن کی اشاعت مناسب نہ تھی۔ یہ غیر شائع شدہ خطوط زیادہ تر معاملات ہی سے متعلق ہیں۔

تیسرے خود حضرت والد صاحبؒ کو اس طرف خصوصی توجہ تھی کہ مسلمانوں کے

اجتماعی، سیاسی اور معاشرتی معاملات، دوست و دشمن کے ساتھ برتاؤ، تنازعات کے تصفیے، میل جول کے انداز، مخالفت و موافقت کی حدود، نرمی و سختی کے مواقع اور ان جیسے دوسرے امور میں اپنے شیخؒ کے طرز فکر و عمل کا بغور مشاہدہ کر کے اس سے اپنی زندگی میں سبق لیں۔
حضرت والد صاحبؒ خود تو اضعاً فرمایا کرتے تھے کہ "میں تھانہ بھون میں کثرت عبادت اور ذکر و شغل کی اس نعمت سے تو خاطر خواہ حصہ نہ لے سکا جس سے دوسرے حضرات فیض یاب ہوئے، لیکن بفضلہ تعالیٰ حضرتؒ کے انداز معاملات و معاشرت کو اس طرح بغور پڑھنے کا موقع ملا ہے کہ وہ انداز دل و نگاہ میں سما گیا ہے۔"

ان تمام باتوں کا نتیجہ تھا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے خصوصی مشرب و مذاق کے اس پہلو کو آپ نے جس طرح جذب فرمایا وہ حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں آپ کا ایک انفرادی امتیاز ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مزاج و مذاق کے اس پہلو کو الفاظ میں بیان کیا ہی نہیں جا سکتا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس وصف کو حاصل کرنے کے لئے مفتی محمد شفیعؒ جیسی شخصیت نے حکیم الامت تھانویؒ جیسی شخصیت کے سامنے مدّتوں ریاضت کی ہو، اس کا ہم جیسے لوگوں کو ادراک ہی مشکل ہے، چہ جائیکہ ہم اسے الفاظ کے سانچے میں ڈھال سکیں، اس وصف کی اگر کوئی ناتمام سی تعبیر ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر معاملے میں اعتدال، توازن اور رعایت حدود کی وہ دولت عطا فرمائی تھی جو آپ کی ایک ایک نقل و حرکت میں خوشبو کی طرح بسی ہوئی تھی۔ اس سلسلے کے چند متفرق واقعات اور آپ سے سنی ہوئی چند باتیں ذیل میں پیش خدمت کر رہا ہوں شاید ان سے اس وصف کا کچھ اندازہ ہو سکے، مگر ان واقعات کو سوچ سوچ کر استیعاب اور ترتیب کے ساتھ بیان کرنا چاہوں تو ایک مبسوط کتاب تیار ہو جائے، اور اس کی تکمیل میں شاید مہینے لگ جائیں، لیکن اس کی نہ اس وقت مہلت ہے نہ موقع، زندگی رہی اور اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو انشاء اللہ پھر کبھی یہ فرض اتارنے کی کوشش کروں گا، اس وقت تو کسی خاص اہتمام کے بغیر جو واقعات جس ترتیب سے ذہن میں آرہے ہیں انہیں جوں کا توں پیش خدمت کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی حضرت والد صاحبؒ ہی سے سنے ہوئے ایک مقولے پر عمل ہے جو آپ بکثرت سنایا کرتے تھے کہ:

الاستقصاء شوم

ہر کام کو انتہا تک پہنچانے کی فکر میں نحوست ہوتی ہے

یعنی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کا آغاز کرنے کے بعد اس فکر میں رہتا ہے کہ اسے کمیت اور کیفیت ہر اعتبار سے ایسا مکمل اور جامع بنادوں کہ اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی گنجائش باقی نہ رہے' اس فکر کا نتیجہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ وہ کام بالکل نہیں ہو پاتا' اس کے بجائے اگر انسان اس قاعدے پر عمل کرے جسے عربی میں "مالا یدرک کلہ لا یترك كلـه" سے تعبیر کرتے ہیں' اور اردو والوں نے اس بات کو ان الفاظ میں کہا ہے کہ : "کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے" تو قطرہ قطرہ ہو کر بہت سا کام ہو جاتا ہے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے تصنیف و تالیف کا جو غیر معمولی کام لیا' ظاہری اسباب میں اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آپ نے استقصاء کی فکر کرنے کے بجائے جتنی مفید بات جس وقت زیرِ قلم آگئی' اسے مزید کے انتظار میں نہیں ٹلایا' بلکہ اسے لکھ کر شائع فرمادیا' تکمیل اور اضافے بعد میں بھی ہو سکتے ہیں' لیکن جو بات مفید ہو اسے استقصاء کے انتظار میں ٹلانے سے ضروری بات بھی رہ جاتی ہے۔

لہٰذا نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ماحضر پیش خدمت ہے' تفصیل و ترتیب بعد میں بھی ہو سکتی ہے :

حقیقتِ علم

ا۔ گزشتہ صفحات میں حضرت والد صاحبؒ کے علمی مذاق اور علم دوستی کے بارے میں بہت سی باتیں تفصیل سے لکھ چکا ہوں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ کی شخصیت بنیادی طور پر ایک علمی شخصیت تھی' آپ کی ساری عمر درس و تدریس اور تصنیف و افتاء جیسے کاموں میں بسر ہوئی۔ کتب بینی کے شوق اور ذوق مطالعہ کے بارے میں بھی پیچھے لکھ چکا ہوں کہ اس دور میں اس کی نظیریں کم ہی ملیں گی' لیکن اس زبردست علمی انہماک کے باوجود یہ حقیقت ہر آن آپ کے ذہن میں مستحضر رہتی تھی کہ یہ کتابی علم اور وسعت مطالعہ محض ایک خول ہی خول ہے' اور جب تک اس میں عمل اور خشیت اللہ کی روح پیدا نہ ہو اس وقت تک انسان خواہ کتنا بڑا عالم اور محقق بن جائے' اس کی ساری علمی تحقیقات بے وزن اور بے جان رہتی ہیں۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر صرف علم کسی شخص کی عظمت کے

لئے کافی ہوتا تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے' اور وہ مستشرقین جو دن رات علمی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں' وہ بھی بہت سے مسلمان اہل علم سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں' لیکن ظاہر ہے کہ ایسے علم کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جو انسان کو ایمان کی دولت نہ بخش سکے' اسی طرح جو علم انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز نہ ہو وہ بے کار ہے۔

کہنے کو تو یہ بات کہتے ہیں کہ عمل کے بغیر علم بیکار ہے لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جن کی زندگی میں یہ بات پیوست ہو چکی ہو' حضرت والد صاحبؒ کی ادا ادا میں یہ حقیقت جلوہ گر نظر آتی تھی' علم و تحقیق کے کام سے اس درجہ وابستگی کے باوجود آپ کو اس علم و تحقیق سے نفرت تھی جو انانیت اور خود بینی پیدا کرے' آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مدرسہ میں پڑھانے کے لئے مشاہیر محققین تلاش کرتے ہیں' لیکن مجھے ایسے متواضع اللہ والے چاہییں جو علمی تکبّر' خود رائی اور خود پسندی سے پاک ہوں اور اپنے شاگردوں کو مسلمان بنا سکیں' خواہ علم و تحقیق میں ان کا پایہ کسی قدر کم کیوں نہ ہو۔

خود آپ کا یہ حال تھا کہ علم و تحقیق کے اس مقام بلند کے باوجود جو اس دور میں خال خال ہی کسی کو حاصل ہوا ہے' آپ کو اپنے کسی علمی کارنامے پر کوئی ناز پیدا ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا' اپنی بڑی سے بڑی خدمت کو ہیچ سمجھتے رہے' انسان کو عام طور سے اپنی تحریروں اور اپنے لکھے ہوئے مضامین سے ایک انس پیدا ہو جاتا ہے' چنانچہ مصنفین میں عام طور سے یہ شوق پایا جاتا ہے کہ ان کی تالیفات کا تذکرہ کیا جائے' انہیں سراہا جائے' بہت سے مصنفین کی محفلیں اپنی تصانیف ہی کے ذکر اور ان کی تعریفوں سے لبریز ہوتی ہیں' بعض لوگ جابجا اپنی تالیفات کے حوالے دے کر ان کے اقتباسات لوگوں کو سناتے رہتے ہیں' کبھی کسی میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ کرنے کا اصل کام وہی تھا جو اس نے انجام دے دیا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کے یہاں اس قسم کی باتوں کا نہ صرف یہ کہ کوئی سوال نہیں تھا' بلکہ آپ کو اس قسم کے ہر طرز عمل سے سخت کراہیت تھی' آپ بڑے سے بڑا تالیفی کام کر گزرنے کے باوجود اسی فکر میں رہتے کہ نہ جانے اس کا حق ادا ہوا یا نہیں؟ محض لوگوں کی تعریف سے آپ کو خوشی حاصل نہ ہوتی' ہاں! اگر کسی جگہ سے یہ اطلاع ملتی کہ فلاں کتاب سے فلاں شخص کو کوئی عملی فائدہ پہنچا ہے' اس کی زندگی میں تبدیلی آئی ہے' یا اس کی نظریات بدلے ہیں تو آپ بہت خوش ہوتے' اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے' اور اس

خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کی دعا فرماتے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ہم خیال لوگوں سے کچھ داد وصول ہوگئی تو کیا فائدہ؟ اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے کتاب لکھی گئی تھی اسے فائدہ پہنچایا نہیں؟

"تفسیر معارف القرآن" کی شکل میں آپ نے جو عظیم علمی کارنامہ انجام دیا، آج بفضلہٖ تعالیٰ وہ ایک دنیا کو سیراب کررہا ہے، اور عام مسلمانوں سے لے کر علماء تک سب اس سے فیض یاب ہورہے ہیں، لیکن جب کوئی شخص آپ کے سامنے اس تفسیر کی تعریف کرتا تو یہی فرماتے کہ : "تفسیر لکھنے کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، البتہ میں نے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے بیان القرآن کو نسبتۃً آسان انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، علماء کرام کے لئے تو شاید اس میں فائدے کی چیزیں زیادہ نہ ہوں، البتہ میں نے عام مسلمانوں کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، خدا کرے کہ اس سے کچھ فائدہ پہنچ جائے۔" لوگ تو عام طور پر دوسروں سے اخذ کی ہوئی باتیں اپنی طرف منسوب کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، حضرت والد صاحبؒ کا معاملہ یہ تھا کہ باوجودیکہ "معارف القرآن" میں وقت کی ضرورت کے بے شمار ایسے مسائل و مباحث موجود ہیں جو "بیان القرآن" اور دوسری تفسیروں کے مباحث سے زائد ہیں، لیکن وہ ہمیشہ یہی فرمایا کرتے کہ اس کتاب میں میں نے کام کیا کیا ہے؟ بس "بیان القرآن" اور بعض دیگر تفاسیر کی تسہیل کرکے انہیں نسبتۃً عام فہم انداز میں بیان کردیا ہے۔

اور یہ محض زبانی باتیں نہ تھیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم کا حقیقی ثمرہ یعنی تواضع کا وہ مقام بلند عطا فرمایا تھا کہ اپنے نفس یا اپنے کسی کام پر آپ کی تعریفی نگاہ پڑتی ہی نہیں تھی، اور بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد خود پسندی کا کوئی شائبہ پیدا ہونے کے بجائے آپ کی بے نفسی میں اور اضافہ ہوجاتا تھا۔

بعض علماء اور مصنفین کو تفرد کا شوق ہوتا ہے، اور جو کوئی تحقیقی یا علمی نکتہ ازخود ان کے ذہن میں آگیا ہو، اسے وہ اپنی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اور اسے بیان کرتے وقت یہ کہنے میں لطف آتا ہے کہ "یہ بات مجھے کہیں بھی نہیں ملی" لیکن حضرتؒ کا معمول اس کے برعکس یہ تھا کہ اگر ازخود کوئی تحقیق یا نکتہ ذہن میں آتا تو اس تلاش میں رہتے کہ علماء متقدمین میں سے کسی کے یہاں وہ منقول مل جائے، اور اگر وہ منقول مل جاتا تو

بے حد مسرور ہوتے' اور اسے اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اسی کی کتاب یاعالم کی طرف منسوب فرماتے جن کے کلام میں وہ ملا ہو' اور فرمایا کرتے تھے کہ "تفرّد سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔" اگر کوئی شخص آپ کی کسی تحریر و تقریر کے بارے میں آپ کو متنبہ کرتا کہ اس میں فلاں بات غلط یا نامناسب درج ہو گئی ہے' تو قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹا ہے یا بڑا' اس کے ممنون ہوتے' اور بات سمجھ میں آجاتی تو فوراً بلا تامّل اس میں تبدیلی فرمادیتے' بلکہ انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی کے اعتراض کو بالکلیہ رد نہ کرنا پڑے' اس غرض کے لئے آپ نے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کی اتباع میں اپنے رسالہ ماہنامہ "المفتی" میں ایک مستقل سلسلہ "اختیار الصواب" کے نام سے جاری فرمایا ہوا تھا۔

پھر اگر آپ اپنے کسی کام یا تالیف و تصنیف کے علمی معیار کے بارے میں مطمئن بھی ہوجاتے تو یہ حقیقت ہر آن مستحضر رہتی کہ اس کام کی اچھائی' برائی کا اصل مدار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہونے پر ہے' اگر یہ اس بارگاہ میں قبول ہے تو سب کچھ ہے' اور اگر خدانخواستہ قبول نہ ہو تو یہ ساری علمی محنت اور تحقیقی کاوش دو کوڑی کی نہیں ہے۔

آخری عمر میں آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "میری ساری عمر کاغذ کالے کرنے میں گزر گئی' تھانہ بھون حاضری ہوئی تو شیخ نے وہاں بھی کاغذ کالے کرنے ہی کے کام میں لگا دیا' اگر اس میں کوئی حرف اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوجائے تو بیڑا پار ہے' ورنہ اپنے سارے اعمال ہیچ در ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔" اور یہ فرما کر آپ اکثر بڑے سوز کے ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

بس ہے اپنا ایک ہی نالہ اگر پہنچے وہاں
یوں تو کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

قرآن کریم کا ارشاد ہے :

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے عالم لوگ ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں

اس آیت میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ علم کا ثمرہ اور اس کی حقیقی علامت اللہ تعالیٰ کی خشیت ہے اور حضرت والد صاحبؒ اکثر ہم طالب علموں سے خطاب کرکے فرمایا کرتے تھے

کہ جب علم حقیقی کی علامت خشیت اللہ ہے تو ہر عالم یا طالب علم کو بار بار اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ یہ علامت اس میں پیدا ہوئی یا نہیں' اور مثال دے کر فرماتے کہ جب کوئی مسافر ریل گاڑی میں سوار ہو کر کسی منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے تو وہ بار بار کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھتا ہے کہ اب کونسا اسٹیشن آیا ہے؟ اگر وہی اسٹیشن راستے میں پڑ رہے ہیں جو منزل مقصود کے راستے میں آیا کرتے ہیں تو مطمئن ہو جاتا ہے' اور انہی اسٹیشنوں سے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ منزل کتنی دور ہے؟ اور اگر اسٹیشن ایسے نامانوس آنے لگیں جو اس منزل کے راستے میں نہیں پڑتے تو سمجھ جاتا ہے کہ گاڑی کسی اور رخ پر جا رہی ہے' اور گھبرا کر گاڑی بدلنے کی فکر کرتا ہے۔ اسی طرح علم کے مسافر کو بار بار اپنے دل کی کھڑکی میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کہ "خشیت اللہ" کا اسٹیشن آیا یا نہیں؟ اگر اس اسٹیشن کے کچھ آثار معلوم ہوتے ہیں تو سفر صحیح سمت میں ہو رہا ہے 'لیکن اگر خشیت' تواضع' انابت الی اللہ اور اتباع سنت کے بجائے بے فکری' تکبر و انانیت' حب جاہ و مال اور نفس پرستی کے اسٹیشن آرہے ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ انسان کسی غلط گاڑی میں سوار ہے' اور یہ گاڑی اسے علم کی اس منزل تک نہیں پہنچا سکتی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلوب ہے۔

اس موثر تمثیل کے بعد آپ حضرت مولانا رومیؒ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

خشیت اللہ را نشان علم داں
آیت یخشی اللہ در قرآن بخواں

غرض خشیت' تواضع اور انابت الی اللہ کا یہ استحضار حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے علم کا وہ جزو لاینفک تھا جو آپ کی ہر تحریر و تقریر میں جلوہ گر ہے' اور جس نے آپ کے علمی افادات کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

اختلاف رائے کا انداز

۲۔ علم و تحقیق کے سفر میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں جہاں ایک طالب علم کو کسی دوسرے عالم سے اختلاف کرنا پڑتا ہے' اور بعض مقامات پر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف کرنا پڑتا ہے' اس سلسلے میں حضرت والد صاحبؒ کا طرز عمل یہ تھا کہ نہ تو کسی کا ادب و احترام اس سے اختلاف رائے کے اظہار میں مانع ہوا' اور نہ کبھی اختلاف رائے نے ادب و احترام میں ادنیٰ

رخنہ اندازی کی' آپ نے بعض مسائل میں بڑے بڑے علماء سے بھی اختلاف کیا' بلکہ اپنے شیخ ومربی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ سے بھی چند فقہی مسائل میں اختلاف رائے رہا' اور خود حضرتؒ نے آپ سے یہ فرمایا کہ تمہارے دلائل پر مجھے شرح صدر نہیں ہوتا' اور میرے دلائل پر تمہیں شرح صدر نہیں' اس لئے دونوں اپنے موقف پر رہیں تو کچھ حرج نہیں' لیکن ایسے مواقع پر حضرت والد صاحبؒ کا عام معمول یہ تھا کہ جن صاحب سے اختلاف رائے ہوا ہے' نہ صرف یہ کہ ان کے ادب و احترام میں کوئی ادنیٰ فرق نہ آنے دیتے' بلکہ ان کے کلام کا کوئی صحیح محمل بھی تلاش کرکے لکھ دیتے' مثلاً "اوزان شرعیہ" میں رائج الوقت اوزان کے لحاظ سے "درہم" کی مقدار مقرر کرنے میں آپ نے حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ جیسے بڑے محقق عالم سے اختلاف فرمایا' لیکن اس کے لئے صرف اپنے دلائل اور حضرت مولاناؒ کے دلائل کی تردید پر اکتفاء نہیں کیا' بلکہ جستجو کرکے وہ وجہ بھی بیان فرمادی جس سے حضرت مولاناؒ کا عذر واضح ہوجاتا ہے۔

بڑوں کے علاوہ جب کبھی اپنے کسی معاصر عالم سے بھی کسی مجتہد فیہ مسئلے میں کوئی اختلاف ہوتا تو آپ اس کے ادب و احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے' اور کوئی ایسا اقدام نہ فرماتے جس سے اس کے علمی مقام کو ٹھیس پہنچے' یا عوام میں اس کا اعتماد مجروح ہو۔

غلطیوں پر ٹوکنے کا انداز

۳۔ "امر بالمعروف" کی طرح "نہی عن المنکر" بھی اہم شرعی فریضہ ہے' لیکن اس فریضے کی ادائیگی بڑی حکمت اور للّٰہیت چاہتی ہے' اور جب تک اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال نہ ہو' اس نازک فریضے کی ادائیگی میں اعتدال و توازن کی حدود پر قائم رہنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت والد صاحبؒ کا جو طرز عمل دیکھا اور رعایت حدود کی جو عجیب و غریب باتیں دیکھنے سننے میں آئیں ان میں سے چند ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ نکیر (ملامت) ہمیشہ منکر (بری یا ناجائز بات) پر ہونی چاہئے اور غیر منکر پر نکیر کرنا خود نکیر ہے۔ لہٰذا بعض لوگ جو مباحات پر یا محض آداب و مستحبات کے ترک پر نکیر کرنا شروع کردیتے ہیں' ان کا طرز عمل درست نہیں ہے۔ آداب و مستحبات کی تعلیم و تبلیغ تو کرنی چاہئے' ان کی ترغیب بھی دینی چاہئے' اگر کوئی شخص کسی

مستحب کو چھوڑ دے تو اسے تنہائی میں نرمی سے متوجہ کرنے میں بھی مضائقہ نہیں، لیکن اس پر نکیر و ملامت کرنا کسی طرح جائز نہیں۔

حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو حضرات شخص کسی ترک مستحب پر مجمع عام میں روک ٹوک یا ناراضگی کا اظہار شروع کر دیتے ہیں ان کے طرز عمل میں دو غلطیاں ہوتی ہیں، ایک تو غیر منکر پر نکیر کرنا، دوسرے جس شخص پر روک ٹوک کی جارہی ہے اسے مجمع عام میں رسوا کرنے کا انداز اختیار کرنا اور اللہ بچائے بعض اوقات اس تمام نکیر و ملامت کے پس پشت عجب و پندار اور نفسانیت بھی کارفرما ہوتی ہے جو ایک مستقل گناہ ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو حضرات اس طرز عمل پر کاربند ہوتے ہیں۔ عام طور سے دیکھا یہ ہے کہ دین کے اہم معاملات سے ان کی نگاہیں اوجھل رہتی ہیں۔ آداب و مستحبات بڑے محبوب اعمال ہیں، ان پر جتنا وسعت میں ہو، عمل کرنا چاہئے، اور دوسروں کو پیار محبت سے ان کی ترغیب بھی دینی چاہئے، لیکن ان کے ترک پر نکیر و ملامت کا انداز اختیار کرنا درست نہیں۔

۴۔ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ اگر کسی عالم یا دینی مقتداء کے حلقۂ اثر میں آپ کا جانا ہوتا، اور وہاں کے عوام میں آپ کوئی ایسی عام غلطی دیکھتے جو اس عالم یا مقتدائے کے علم میں رہی ہو تو وہ اس غلطی پر خود عوام کو نہیں ٹوکتے بلکہ اس عالم یا مقتداء کو تنہائی میں متوجہ فرمادیتے تھے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف سے مسئلہ بتا کر ان کے عمل کی اصلاح کردیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان فرماتے تھے کہ اگر میں براہ راست لوگوں کو مسئلہ بتادوں تو لوگ شاید میرے علم و فضل کے تو قائل ہو جائیں، لیکن جس عالم یا دینی رہنما سے ان کا دن رات کا سابقہ ہے اس کی طرف سے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہوگی کہ ہم اتنے دن سے ان صاحب کے ساتھ رہتے ہیں، مگر انہوں نے ہمیں کبھی اس غلطی پر متوجہ نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص سے انہیں دینی فائدہ پہنچ رہا تھا اس پر اعتماد میں کمی آجائے گی جو ان کے دین کے لئے نقصان دہ ہوگی۔

ایک مرتبہ ایک ایسے ہی موقع پر حضرت والد صاحبؒ نے بتایا کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ تو اس معاملے میں اس حد تک احتیاط فرماتے تھے کہ جب کبھی کسی دوسرے شہر میں جانا ہوتا، اور کوئی شخص مسئلہ پوچھنے کے لئے آتا تو عام طور سے خود بتانے کے بجائے اس شہر کے مفتی کا پتہ بتاتے کہ ان سے جاکر معلوم کرو، اور اپنے

رفقاء سے فرماتے کہ اگر میں اس شخص کو مسئلہ بتادوں' اور مقامی علماء یا مفتی حضرات کے بتائے ہوئے مسئلے سے کچھ فرق ہوجائے تو میں تو کل یہاں سے چلا جاؤں گا' اور یہ لوگ مقامی علماء سے بدگمان ہو کر آئندہ مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے وقت جھجک محسوس کریں گے۔

اللہ اکبر! اندازہ لگایئے ان حضرات کی حکیمانہ اور دور رس نگاہ کا کہ دینی ضرورتوں کے معاملے میں کہاں تک نظر پہنچتی ہے' اور یہ سب کچھ درحقیقت ثمرہ ہے اس اخلاص اور للّٰہیت کا جس کے پیش نظر اپنی بات اونچی کرنا یا اپنی علمیت جتانا نہیں' بلکہ صحیح معنی میں دین کی خدمت اور عوام کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔

۵۔ مجمع عام میں کسی شخص کو رسوا کن انداز میں ٹوکنے کا تو آپ کے یہاں سوال ہی نہ تھا' عام طور سے تنہائی میں فہمائش فرمایا کرتے تھے' لیکن اس میں بھی طریقہ یہ تھا کہ بات بات پر تنبیہہ فرمانے کے بجائے ایک مرتبہ اطمینان سے بٹھا کر تمام ضروری باتوں پر متنبّہ فرمادیتے تھے' جس وقت کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو اس وقت کبھی اسے نہیں سمجھاتے تھے' بلکہ ایسے طریقے اختیار فرماتے جس سے اس کے جذبات پہلے ٹھنڈے ہوجائیں' اور جذبات کے معتدل ہوجانے پر فہمائش کرتے تھے۔

اسی طرح جب آپ اپنی اولاد' شاگردوں' یا مرشدین میں سے کسی کو سختی کے ساتھ تنبیہہ کی ضرورت فرماتے تو عام طور سے ایسی حالت میں اسے نہیں ڈانٹتے تھے جب خود طبعی طور پر غصہ آرہا ہو' اس کے بجائے ایسے وقت کا انتظار فرماتے تھے جب اپنے جذبات معتدل ہوجائیں' چنانچہ جب طبعی غصہ ٹھنڈا ہوتا اور طبیعت پر نشاط ہوتا تو اس وقت اسے بلوا کر تنبیہہ کرتے' اور ضرورت ہوتی تو غصے کا اظہار بھی فرماتے' سخت سے سخت بات بھی کہہ دیتے' لیکن یہ سب کچھ خالص تادیب کے لئے ہوتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ طبعی غصے کی حالت میں تنبیہہ کرتے ہوئے اعتدال پر قائم رہنا بہت مشکل ہوتا ہے' اور اس میں اس بات کا فوری خطرہ ہوتا ہے کہ تادیب کے بجائے طبعی جذبات گفتگو میں شامل ہوجائیں اور جتنی سختی کی فی الواقعہ ضرورت ہے اس سے زیادہ سختی ہوجائے جو انصاف کے بھی خلاف ہو اور مقصد کے لئے بھی مضر ہے۔

فرمایا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی نصیحت یہی

تھی کہ جب کبھی بچوں کو ڈانٹنے یا سزا دینے کی ضرورت ہو تو غصے کی حالت میں کبھی نہ دو' معتدل حالت میں جتنی سختی ضروری ہو اتنی کرو' خواہ اس کے لئے مصنوعی غصہ پیدا کرنا پڑے' ورنہ طبعی غصے میں جو تنبیہہ ہوتی ہے اس میں تادیب کا پہلو پیچھے چلا جاتا ہے' اور محض غصہ نکالنا رہ جاتا ہے۔

۶۔ پھر حضرت والد صاحبؒ کا معمول یہ بھی تھا کہ جب کبھی اپنے کسی چھوٹے یا ماتحت پر غصہ کا اظہار فرماتے یا ضرورۃً اس پر سختی فرماتے تو کسی دوسرے وقت اس کی اس طرح دلداری بھی ضرور فرمادیتے تھے جس سے دل شکنی کا اثر تو زائل ہو جائے' لیکن تادیب کا اثر زائل نہ ہو' کبھی اس کی کوئی مالی مدد فرمادی' کبھی اس کے کسی اچھے کام پر انعام دے دیا' کبھی مجمع عام میں اس کی کسی خوبی کی تعریف فرمادی' غرض کسی مناسب طریقے سے اس کی ہمت افزائی کا سامان بھی فرمادیتے تھے۔

۷۔ حضرت والد صاحبؒ کے عمل میں بارہا اس بات کا مشاہدہ ہوا کہ عین غصے کی حالت میں جب آپ کسی کو ڈانٹ رہے ہوں' اگر خود یا کسی کے متوجہ کرنے سے اپنی کسی غلطی کا احساس ہو جاتا تو عین غصے میں بھی اس کا اعتراف فرمالیتے' اور اس پر استغفار بھی فرماتے۔

یہ بات کہنے میں جتنی آسان ہے' عمل میں اتنی ہی مشکل ہے' اور جب تک کسی شخص نے اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے برسوں کسی شیخ کاملؒ کی زیر نگرانی ریاضت نہ کی ہو' اس پر عمل بے حد دشوار ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحبؒ کا یہ طرز عمل درحقیقت اپنے شیخ کے عمل سے مستنیر تھا۔ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کا یہ واقعہ احقر نے حضرت والد صاحبؒ سے بار بار سنا' اور پھر احقر کے شیخ و مربی سیدی و سندی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی نے بھی سنایا کہ حضرتؒ کے ایک خادم نیاز صاحب تھے' ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے حضرتؒ کی خدمت میں ان کی یہ شکایت کی کہ انہوں نے بلاوجہ کچھ لوگوں سے تلخ کلامی کی ہے' تھوڑی ہی دیر میں نیاز صاحب آگئے تو حضرتؒ نے ان سے قدرے تلخ لہجے میں کہا :

"کیوں نیاز میاں! تم ہر وقت لوگوں سے کیوں لڑتے پھرتے ہو"؟

اس کے جواب میں نیاز صاحب کے منہ سے نکل گیا :

"حضرت! اللہ سے ڈرو، جھوٹ نہ بولو۔"[1]

اندازہ لگایئے کہ اگر آج کسی بڑے سے بڑے بااخلاق شخص یا عالم کے سامنے اس کا کوئی ملازم یہ جملہ کہے تو اس کا غصہ کس انتہا پر پہنچے گا، لیکن یہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ تھے کہ اپنے ملازم کی زبان سے "اللہ سے ڈرو" کا جملہ سنتے ہی سارا غصہ کافور ہوگیا۔ اور فوراً گردن جھکا کر "استغفر اللہ، استغفر اللہ" کہتے ہوئے دوسری طرف تشریف لے گئے۔ درحقیقت عین غصے کی حالت میں ملازم سے یہ جملہ سن کر حضرت کو تنبہ ہوا کہ میں نے صرف ایک طرف کی بات سن کر ملازم کو ڈانٹنا شروع کردیا ہے، حالانکہ پہلے اس کی بات بھی سنی چاہیئے تھی، اس تنبہ کے ساتھ ہی آپ کا طرز عمل بدل گیا۔ کسی صاحب نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کہا ہے کہ :

کان وقافا عند حدود اللّٰہ

وہ اللہ کی حدود کے آگے رک جانے والے تھے

حضرت والد صاحبؒ یہ مقولہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کی اس صفت کا جتنا مظاہرہ حضرت حکیم الامت کے معاملات زندگی میں دیکھا، اتنا کہیں دیکھنے میں نہیں آیا، اور کیوں نہ ہوتا؟ حضرت تھانوی قدس سرہ حضرت فاروق اعظمؓ کے نسبی اور معنوی دونوں اعتبار سے وارث تھے۔

عقیدت کی حدود

۸۔ انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرامؓ اور بزرگان سلف کی عقیدت و محبت چونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا مظہر ہوتی ہے، اس لئے ایک حیثیت سے، وہ جزو ایمان ہے اور یہ وہی "حب فی اللہ" ہے جسے حدیث میں کمال ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے، لیکن اس عقیدت و محبت کی

---

[1] احقر کے شیخ و مربی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی نے فرمایا کہ نیاز صاحب ویسے بڑے باادب تھے، اور حضرتؒ سے بے پناہ عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے، اور ان سے ایسی بے ادبی کا جملہ جان بوجھ کر نہیں نکلا تھا، بلکہ غالباً کہنا وہ یہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں نے آپ سے یہ شکایت کی ہے وہ اللہ سے ڈریں، جھوٹ نہ بولیں، لیکن شدت جذبات کی بدحواسی میں ان کے منہ سے یہ جملہ حضرتؒ ہی کے لئے نکل گیا۔

بھی حدود ہیں'اگر اس میں کمی ہو تو انسان کے دین میں نقص ہے'اور حد سے زیادتی ہو جائے تو وہی بدعت' بلکہ بعض صورتوں میں شرک بن جاتی ہے۔

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو بھی بزرگان دین سے بہت عقیدت و محبت تھی' جب آپ بزرگوں کا تذکرہ فرماتے تو آپ پر ایک عجیب محویت سی طاری ہو جاتی' کوئی اور آپ کے سامنے بزرگان دین کا ذکر کرتا تو شوق سے سنتے'اور قدرتی بات ہے کہ جن بزرگوں کے ساتھ انسان کو رہنے کا موقع ملا ہو ان سے مناسبت بھی زیادہ ہوتی ہے' اس لئے اپنے اساتذہ و مشائخ اور اکابر علمائے دیوبند کے تذکرے میں تو آپ بے خود سے ہو جاتے تھے' لیکن اس تمام عقیدت و محبت کے باوجود آپ حدود کی ایسی نازک رعایتیں فرماتے تھے کہ ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

آپ کو اپنی زندگی میں جس قدر عقیدت و محبت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے تھی' روئے زمین پر اتنی عقیدت و محبت کسی سے نہیں ہوئی' حضرت ؒ کا اسم گرامی زبان پر آتے ہی آپ کے چہرے پر عجیب بشاشت پیدا ہو جاتی' اور بار بار اس قسم کے جملے ارشاد فرماتے کہ :

"ہمارے حضرت ؒ کا معاملہ عجیب تھا' ہمارے حضرتؒ کے یہاں تو ہر چیز عجیب تھی' حضرت کی تو شان ہی عجیب تھی'۔" اس کے باوجود ان کے ساتھ اظہار عقیدت میں حدود کی جو رعایت دیکھنے میں آئی' کم از کم احقر نے اس کی نظیر نہیں دیکھی۔ دو واقعات سے اس کا کچھ اندازہ ہو گا۔

۱۳۹۲ھ میں جب حضرت والد صاحبؒ کو پہلی بار دل کا شدید دورہ ہوا' اور اس کی وجہ سے آپ تین ہفتے ہسپتال میں رہے تو آپ نے اپنے شیخ ؒ کے طرز عمل کے مطابق ایک مضمون شائع کرایا جس میں اپنے احباب اور ملنے جلنے والوں سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ اگر انہیں آپ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو اسے للّٰہ فی اللہ معاف فرمادیں' اور اگر کوئی مالی حق کسی کے ذمے رہ گیا ہو تو وہ وصول کرلیں یہ مضمون "کچھ تلافیٔ مافات" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

جب حضرت والد صاحبؒ کے دل میں اس مضمون کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا تو آپ نے احقر کو اس کا مفہوم بتلا کر اسے تحریری شکل میں مرتب کرنے کا حکم دیا' اور یہ ہدایت

فرمائی کہ پہلے حضرت تھانوی قدس سرہ کے رسالے "ا لعذروا لنذر" کو پڑھ لینا، اور مضمون کی تمہید میں حضرتؒ کے اس رسالے کا تعارف کرانے کے بعد اسی کے طرز پر اسے بھی مرتب کردینا۔

احقر کو جب کبھی حضرت والد صاحبؒ کی طرف سے کوئی تحریر لکھنی ہوتی تھی تو اس کا بڑا بوجھ ہوتا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کا محض کرم تھا کہ کئی مرتبہ آپ کی مختلف تنبیہات سے سرفراز ہونے کے بعد احقر کی تحریر والد صاحبؒ کے لئے قابل برداشت ہوگئی تھی، اور آپ کبھی ہمت افزائی کے لئے یہ بھی فرمادیتے تھے کہ "بحمد اللہ، اب مجھے تمہاری تحریر میں عموماً قلم لگانا نہیں پڑتا۔"

اس کے باوجود اس تحریر کا مجھ پر بہت بوجھ تھا، معاملہ بھی نازک سا تھا، جس میں بہت سے پہلوؤں کی رعایت کرنی تھی، اور سب سے بڑھ کر ایک جذباتی رکاوٹ تھی، اور وہ یہ کہ والد صاحبؒ اس مضمون کے آغاز میں اس مفہوم کے جملے لکھوانا چاہتے تھے کہ "اب میرا وقت قریب معلوم ہوتا ہے کسی بھی وقت بلاوا آسکتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ، اور یہ جاننے کے باوجود کہ یہ باتیں حقیقت ہیں مجھے اس ماحول میں اپنے قلم سے اس قسم کے جملے لکھنا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے سے زیادہ صبر آزما معلوم ہوتا تھا۔ اور اس زمانے میں اباجیؒ کی طبیعت بہت کمزور، نازک اور حساس ہوگئی تھی، مزاج کے خلاف ذرا سی بات سے طبیعت میں تغیّر پیدا ہوجاتا جو بعض اوقات صحت کے لئے سخت مضر ہوتا تھا، اس کے علاوہ طبعی پریشانی ہسپتال کے انتظامات اور وہاں کے ماحول کی وجہ سے کسی تحریری کام کے لئے ذہنی یکسوئی بھی میسر نہ تھی، اس لئے یہ چار صفحات کی تحریر میرے لئے ایک پہاڑ بن گئی۔

بہرکیف! اللہ تعالیٰ سے دعا کی، خدا جانے کس طرح میں نے یہ چار صفحے لکھے، اور حضرت والد صاحبؒ کو سنانے شروع کئے، یہ تو انہی کی دعا و توجہ کی برکت تھی کہ بالآخر انہوں نے اسے پسند فرمالیا، لیکن ابتداء میں جب میں نے لرزتی ہوئی آواز میں یہ مضمون سنانا شروع کیا اور اس میں اس قسم کا جملہ آیا کہ "حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس مقصد کے لئے ایک رسالہ شائع فرمایا تھا" تو میں نے دیکھا کہ حضرتؒ کے چہرے پر قدرے تکدّر کے سے آثار نمودار ہوئے اور فرمایا :

"جاؤ میاں! تمہیں اب تک حضرتؒ کا نام بھی لکھنا نہ آیا، اور حضرتؒ کا تذکرہ اس

طرح کردیا جیسے کسی اجنبی عالم کا ذکر کردیا جاتا ہے 'خدا کے بندے! تم یہ تحریر میری طرف سے لکھ رہے ہو' اور اس حالت میں لکھ رہے ہو تو حضرتؒ کے ساتھ میرے تعلق کو بھی تو ملحوظ رکھو' وہ امت کے تو حکیم تھے' مگر یہ بھی تو بتاؤ کہ میرے کیا تھے؟ تمہیں الفاظ کا بخل بھی یہیں کرنا تھا' ارے یوں لکھو کہ میرے شیخ و مرشد' میرے آقا اور مربّی' سیدی و سندی مولائی و مرشدی ..... الخ" اور ان آخری الفاظ پر آپ کی آواز بھرّا گئی' آنکھوں میں آنسو چھلک آئے' اور شدت جذبات میں سر تکیے پر ڈھلک گیا۔

ایک طرف اس واقعے سے حضرتؒ کے ساتھ آپ کے اس جذباتی تعلق کا اندازہ لگائیے' اور دوسری طرف ایک اور واقعہ سنئے۔

غالباً حضرت والد صاحبؒ کے ہسپتال سے واپس گھر تشریف لانے کے بعد ایک مرتبہ مجھے ایک اور تحریر لکھنی تھی' اور اس میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا تذکرہ بھی تھا' اس میں احقر نے حضرتؒ کے لئے کچھ اس قسم کے الفاظ لکھے تھے کہ "اس چودھویں صدی کے مجدد دین حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ"

میں کوشش یہی کرتا تھا کہ اپنی کوئی تحریر حضرت والد صاحبؒ کو سنائے یا دکھائے بغیر شائع نہ کروں' چنانچہ میں نے یہ تحریر بھی آپ کی خدمت میں بغرض ملاحظہ پیش کی' آپ نے جب وہ تحریر مجھے واپس کی تو میں نے دیکھا کہ اس میں "چودھویں صدی کے مجدّد دین" کے الفاظ کاٹ کر آپ نے ان کی جگہ "مجدد ملّت" کے الفاظ تحریر فرمادیئے تھے' میں اس اصلاح پر ابھی غور بھی نہ کرپایا تھا' اور چہرہ سوالیہ نشان ہی بنا ہوا تھا کہ آپ نے خود فرمایا :

"سمجھے! یہ الفاظ میں نے کیوں بدلے ہیں؟"

احقر نے عرض کیا : "نہیں آپ ہی بیان فرمادیں۔"

فرمایا کہ : "دراصل مجدّد دین کوئی ایسا معین منصب نہیں ہوتا جیسے نبی اور رسول ایک معین منصب ہے' صدی کے آغاز میں جس مجدد کی خبر دی گئی ہے وہ فرد واحد بھی ہو سکتا ہے اور افراد کا ایک طائفہ بھی ہو سکتا ہے اور مجدد کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اسے اپنے مجدد ہونے کا علم و یقین ہو' اور نہ کسی دوسرے شخص کے پاس کوئی ایسا یقینی ذریعہ ہوتا ہے جس سے وہ کسی فرد کو معین اور قطعی طور پر اس صدی کا مجدد قرار دے سکے' چنانچہ اس کے تعین میں رائیں مختلف بھی ہو سکتی ہیں' اس ذیل میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی

ہے وہ یہ ہے کہ فلاں صاحب کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ اس صدی کے مجدد تھے' حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے بارے میں ہمارا گمان غالب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس صدی کا مجدد بنایا تھا' لیکن بالکل حتمی 'یقینی اور قطعی طور پر یہ بات کہنا درست نہیں' کیونکہ اس معاملے میں حتم و یقین کی کوئی شرعی حجت ہوتی ہی نہیں' ہاں! اس بات کا یقین بلکہ عین الیقین ہے کہ حضرتؒ نے جو کارنامہ انجام دیا وہ تجدیدی کارنامہ ہے' اور آپ سے اللہ تعالیٰ نے ملت کی تجدید و احیاء کا عظیم کام لیا ہے' اس لئے "مجدد ملت" کے الفاظ زیادہ محتاط اور قرین صواب ہیں"

اندازہ لگایئے کہ کس باریک نکتے کی طرف نظر گئی اور جس ذات کے ساتھ تعظیمی الفاظ کی کمی سے آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے' اسی کی تعریف و توصیف میں ایک حد سے ذرا نکلا ہوا لفظ برداشت نہ ہو سکا' ہر چیز کو اسکی صحیح حد میں رکھنے کے لئے عدل و انصاف کی یہ ترازو اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو عطا فرماتا ہے' جن کی عقیدت و محبت خالص اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے۔

حمایت و مخالفت کی حدود

۹۔ کسی شخص یا جماعت کی حمایت و مخالفت میں جب نفسانیت شامل ہو جاتی ہے تو نہ حمایت اپنی حدود پر قائم رہتی ہے نہ مخالفت' بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس شخص کی حمایت کرنی ہو اسے سراپا بے داغ اور جس کی مخالفت کرنی ہو اسے سراپا سیاہ ثابت کرنے سے کم پر بات نہیں ہوتی' آجکل حمایت و مخالفت میں اس قسم کے مظاہرے عام ہو چکے ہیں' بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جس زمانے میں منظور نظر ہوا تو اس کی ساری غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسے تعریف و توصیف کے بانس پر چڑھا دیا گیا' اور جب وہی شخص کسی وجہ سے زیر عتاب آگیا تو اس کی ساری خوبیاں ملیامیٹ ہو گئیں اور اس میں ناقابل اصلاح کیڑے پڑ گئے۔

حضرت والد صاحب اس طرز فکر کے سخت مخالف تھے' اور فرمایا کرتے تھے کہ اول تو یہ طریقہ حق و انصاف کے خلاف ہے' اس کے علاوہ اس حد سے گزری ہوئی حمایت و مخالفت کے نتیجے میں بسا اوقات انسان کو دنیا ہی میں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے' اور اس سلسلے میں آپ ایک حدیث کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے..... جو آپ سے اتنی بار سنی ہے کہ اس کے الفاظ آپ

ہی کے لہجے میں یاد ہوگئے ہیں :

احبب حبیبک ھونا ما عسیٰ ان یکون بغیضک یوما ما
وابغض بغیضک ھونا ما، عسیٰ ان یکون حبیبک
یوما ما (ترمذی، ابواب البر والصلۃ باب الاقتصاد فی الحب والبغض)

اپنے محبوب سے اعتدال کے ساتھ محبت کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمہارا مبغوض بن جائے اور جو شخص تمہیں ناپسند ہو اس کے ساتھ ناپسندیدگی کا اظہار بھی اعتدال کے ساتھ کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمہارا محبوب بن جائے۔

دوسروں کی حمایت و مخالفت کے بارے میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کا عمر بھر کا طرز عمل اس روایت کی عملی تشریح کی حیثیت رکھتا تھا، آپ کی نگاہ دشمنوں اور مخالفین میں بھی اچھائیوں کو تلاش کر لیتی تھی، اور ان کی خوبیوں کے برملا اظہار میں بھی آپ کو کبھی باک نہیں ہوا۔

بعض اوقات جب عام فضا کسی شخص یا جماعت کے خلاف ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں الزام تراشی اور افواہ طرازی کو عموماً عیب نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے عیوب کی خبریں لانے میں لطف محسوس کیا جاتا ہے، اور اس میں تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، حضرت والد صاحبؒ ایسے مواقع پر اپنے متعلقین کو اس طرزِ عمل سے سختی کے ساتھ روکتے، اور فرماتے کہ اگر ایک شخص کسی جہت سے برا ہے تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ اس کی تمام جہات لازماً بری ہی ہوں گی، اور اب اس کی بے ضرورت غیبت اور اس کے خلاف بہتان تراشی جائز ہوگئی ہے، قرآن کریم کی اس آیت کو تم کیوں بھول جاتے ہو کہ

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس کے خلاف بے انصافی کے ارتکاب پر ہرگز آمادہ نہ کرے۔

اس ذیل میں حضرت والد صاحبؒ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے ایک صحابی (غالباً حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کے سامنے حجاج بن یوسف پر کوئی غلط الزام لگایا، اس پر

انہوں نے فرمایا کہ یہ مت سمجھو کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم ہے تو اس کی آبرو تمہارے لئے حلال ہو گئی ہے' یاد رکھو کہ اگر اللہ تعالیٰ حشر کے دن حجاج بن یوسف سے اس کے مظالم کا حساب لے گا تو تم سے اس ناجائز بہتان کا بھی حساب لے گا جو تم نے اس کے خلاف لگایا۔

دین کی طلب کا حیرت انگیز مقام

۱۰۔ حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے طلب دین کا عالم یہ تھا کہ علم و فضل میں مرجع خلائق ہونے کے باوجود دین کی کوئی بات جہاں سے ملتی' اسے ذوق و شوق کے ساتھ حاصل کرنے کی فکر میں رہتے' آپ کو اپنے معاصرین' بلکہ چھوٹوں سے بھی استفادے میں نہ صرف یہ کہ کبھی عار محسوس نہیں ہوئی' بلکہ بعض اوقات دوسروں پر اس کا اظہار بھی فرما دیتے تھے کہ یہ بات مجھے فلاں شخص سے معلوم ہوئی۔

اللہ تعالیٰ جنہیں دین کی تڑپ اور طلب علم کا ذوق عطا فرماتا ہے' وہ ہر اس ذریعے کی تلاش میں رہتے ہیں جس سے دین کی کوئی بات معلوم ہو جائے۔ لیکن اس معاملے میں حضرت والد صاحب ؒ کے مقام بلند کا اندازہ آپ کے ایک عظیم ارشاد سے ہو گا۔ ایک روز آپ نے بر سبیل تذکرہ ارشاد فرمایا کہ جب بھی کوئی واعظ کسی جگہ وعظ کہتا ہوا نظر آتا ہے' اور میرے پاس وقت ہوتا ہے تو میں وقت اور موقع کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ دیر کے لئے وعظ ضرور سنتا ہوں' خواہ واعظ میرا چھوٹا ہی کیوں نہ ہو' اور خواہ میں اسے پہچانتا ہوں یا نہ پہچانتا ہوں' چنانچہ اگر راستے پر جاتے ہوئے مجھے کوئی مجلس وعظ نظر آتی ہے تو کچھ دیر رک کر اس کی بات ضرور سن لیتا ہوں۔ اس لئے کہ بعض اوقات تو کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی ہے' اور اگر پرانی ہی بات ہو تو بعض اوقات کہنے والے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ وہ دل پر اثر کر جاتا ہے' اور اس سے بعض ایسی باتوں کی طرف عملاً توجہ ہو جاتی ہے جو پہلے معلوم تو تھیں' مگر عمل میں نہ آئی تھیں' اور اس سے ہمہ دانی کا پندار بھی ٹوٹتا ہے۔

اللہ اکبر! اندازہ لگایئے! اس پیکر علم و فضل کی تواضع' بے نفسی اور للّٰہیت کا کہ جس کی زبان سے چند جملے سننے کے لئے لوگ دور دور سے سفر کر کے آتے تھے' وہ خود چھوٹے چھوٹے واعظوں سے دین کی باتیں سننے کے لئے کتنے اشتیاق کا مظاہرہ کرتا تھا' آج کوئی طلب علم و دین اور تواضع و للّٰہیت کے اس مقام کی نظیر تو پیش کر کے دکھائے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ

اگر کسی جلسے میں تقریر کرنے کے لئے مدعو ہوں تو چند منٹ کسی دوسرے کی تقریر سننا بھاری معلوم ہوتا ہے' اور اگر سنتے بھی ہیں تو استفادے کی غرض سے سننا کسر شان سمجھتے ہیں' اور استفادے کی بجائے تنقید کی نیت سے سنتے ہیں' اور اگر استفادہ کرنا ہی ہو تو ہمارا استفادہ مقرر کے اسلوب بیان یا زیادہ سے زیادہ کسی نئی بات کے معلوم ہونے تک محدود رہتا ہے' لیکن یہ نیت کہ شاید اس کی کسی بات سے اپنے عمل کی اصلاح ہو جائے؟ ہم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ اس نیت کا دور دور کوئی شائبہ بھی کبھی ہوتا ہے؟

وقت کی قدر شناسی

۱۱۔ حضرت والد صاحبؒ کو وقت کی قدر و قیمت کا بڑا احساس تھا' اور آپ ہر وقت اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھتے تھے' اور حتی الامکان کوئی لمحہ فضول جانے نہیں دیتے تھے' آپ کے لئے سب سے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ آپ کے وقت کا کوئی حصہ ضائع چلا جائے آپ سنت کے مطابق گھر والوں کے ساتھ ضروری' اور بسا اوقات تفریحی گفتگو کے لئے بھی وقت نکالتے تھے' لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کے دل میں کوئی الارم لگا ہوا ہے جو ایک مخصوص حد تک پہنچنے کے بعد آپ کو کسی اور کام کی طرف متوجہ کر دیتا ہے' چنانچہ گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد آپ اپنے کام میں مشغول ہو جاتے' سفر ہو یا حضر' آپ کا قلم چلتا ہی رہتا' ریل گاڑی میں تو آپ ایسی روانی سے لکھتے تھے جیسے ہموار زمین پر بیٹھے ہوں' اور تحریر میں کوئی خاص بگاڑ بھی عموماً پیدا نہیں ہوتا تھا' حد یہ ہے کہ احقر نے آپ کو موٹر کار' بلکہ موٹر رکشا تک میں بیٹھ کر لکھتے ہوئے دیکھا ہے' حالانکہ کار اور رکشہ کے جھٹکوں میں کچھ لکھنا انتہائی دشوار ہوتا ہے' مگر آپ ہلکے پھلکے خطوط اس میں بھی لکھ لیتے تھے' یہاں تحریر کے طرز میں کچھ تبدیلی پیدا ہوتی' لیکن خط پھر بھی آرام سے پڑھ لیا جاتا تھا۔

آپ وقت کی وسعت کے لحاظ سے مختلف کاموں کی ایک ترتیب ہمیشہ ذہن میں رکھتے' اور جتنا وقت ملتا اس کے لحاظ سے وہ کام کر لیتے جو اتنے وقت میں ممکن ہو' مثلاً اگر گھر میں آنے کے بعد کھانے کے انتظار میں چند منٹ مل گئے ہیں تو ان میں ایک خط لکھ لیا' یا کسی سے فون پر کوئی مختصر بات کرنی ہو تو وہ کر لی' گھر کی کوئی چیز بے ترتیب یا بے جگہ ہے تو اسے صحیح جگہ رکھ دیا' کوئی مختصر سی چیز مرمت طلب پڑی ہے' تو اپنے ہاتھ سے اس کی مرمت کر لی'

غرض جہاں آپ کو طویل کاموں کے درمیان کوئی مختصر وقفہ ملا' آپ نے پہلے سے سوچے ہوئے مختلف کاموں میں سے کوئی کام انجام دے لیا۔

ایک روز ہم لوگوں کو وقت کی قدر پہچاننے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ ہے تو بظاہر نا قابل ذکر سی بات' لیکن تمہیں نصیحت دلانے کے لئے کہتا ہوں کہ مجھے بے کار وقت گزارنا انتہائی شاق معلوم ہوتا ہے' انتہا یہ ہے کہ جب میں قضاء حاجت کے لئے بیت الخلا جاتا ہوں تو وہاں بھی خالی وقت گذارنا مشکل ہوتا ہے' چنانچہ جتنی دیر بیٹھنا ہوتا ہے' اتنے اور کوئی کام تو ہو نہیں سکتا' اگر لوٹا میلا کچیلا ہو تو اسے دھولیتا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ جب حضرت والد صاحبؒ نے مجھے پہلے پہل ہاتھ کی گھڑی حجاز سے لاکر دی تو ساتھ ہی فرمایا کہ : "یہ گھڑی اس نیت سے اپنے پاس رکھو کہ اس کے ذریعے اوقات نماز کی پابندی کرسکو گے' اور وقت کی قدر و قیمت پہچان سکو گے' میں بھی گھڑی اس لئے اپنے پاس رکھتا ہوں کہ وقت کو تول تول کر خرچ کرسکوں۔" اللہ تعالیٰ انہیں قرب خاص کے مقامات میں ابدی راحتیں عطا فرمائے' وہ اسی طرح زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں زاویہ نظر درست فرما کر انہیں عبادت بنادینے کی فکر میں رہتے تھے۔

طرز معیشت

۱۲۔ حضرت والد صاحب کا طرز معیشت ہمیشہ انتہائی سادہ رہا' ساری عمر ایک ہی لباس اور ایک ہی سی وضع قطع کے پابند رہے' طرز بود و ماند میں ہمیشہ تواضع' سادگی اور مسکنت کی جھلک نمایاں رہی' آمدنی کے لحاظ سے آپ پر مختلف قسم کے دور گزرے' دارالعلوم دیوبند میں پندرہ روپے سے لے کر پینسٹھ روپے ماہانہ تک آپ کی تنخواہ رہی' اس کے بعد مدت تک کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی نہیں تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ابتدائی زمانہ بہت عُسرت میں بسر ہوا' پھر وہ دور بھی آیا کہ بورڈ تعلیمات اسلام کی رکنیت کے زمانے میں ایک ہزار روپے ماہانہ الاؤنس ملنے لگا' لیکن اس تمام اتار چڑھاؤ کے مختلف زمانوں میں آپ کا طرز معیشت یکساں ہی رہا' نہ عسرت کے زمانے میں کبھی بخل سے کام لیا' نہ فراخی کے دور میں کبھی اسراف سے' البتہ آمد و خرچ ہمیشہ انتظام کے ساتھ فرماتے' ہر قسم کے اخراجات کی الگ الگ مدیں مقرر تھیں' جتنی آمدنی ہوتی' ضرورت کے لحاظ سے مختلف مدوں میں تقسیم ہو جاتی

اور جس مد میں جتنے پیسے ہوتے اسی کے لحاظ سے خرچ بھی فرماتے، زمانہ دراز تک یہ معمول رہا کہ ماہانہ اخراجات کا تحریری حساب رکھتے، وہ کاپیاں اب تک محفوظ ہیں جن میں آپ نے چھوٹے چھوٹے اخراجات بھی لکھ کر رکھے ہوئے ہیں اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تھوڑی آمدنی میں کام چلانے کے لئے بخل کی نہیں، انتظام اور قناعت کی ضرورت ہے، اگر انسان اپنی آمدنی کو انتظام کے ساتھ خرچ کرے تو تھوڑی رقم میں بھی کام بن جاتا ہے اور بد نظمی سے کرے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہ ہو۔

مزید فرماتے ہیں کہ لوگ معاشی تنگی کو دور کرنے کے لئے آمدنی بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں، حالانکہ آمدنی کا بڑھنا غیر اختیاری عمل ہے، اور جو کام اپنے اختیار میں ہے، اسے پہلے کرنا چاہئے، یعنی یہ کہ اخراجات کم کئے جائیں اور قناعت اختیار کی جائے، جتنی آمدنی جائز ذرائع سے بس میں ہو، اخراجات کا معیار اسی کے مطابق رکھا جائے۔

بورڈ تعلیمات اسلام کا الاؤنس بھی صرف چند سال جاری رہا، اور وہ بھی اس شان استغناء سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ اپنی زندگی کے کسی کام کا مدار اس پر نہیں رکھا تاکہ دینی ضرورت داعی ہو تو استعفا دینے میں کوئی معاشی مسئلہ بھی رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس کے بعد پھر وہی کیفیت تھی کہ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہ تھا، دارالعلوم کراچی کی بنیاد پڑ چکی تھی، مگر اس سے آپ نے تنخواہ لینا پسند نہیں فرمایا۔

جب تنگی زیادہ ہوئی اور قرضوں کا بار بڑھ گیا تو دارالعلوم کی مجلس منتظمہ کی درخواست پر پانچ سو روپے ماہوار لینا منظور فرمالیا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب اللہ تعالیٰ فراخی عطا فرمائیں گے تو یہ رقم واپس کردی جائے گی، کچھ دنوں کے بعد ترقی معکوس فرمائی، اور پانچ سو کے بجائے تین سو روپے ماہانہ لینے شروع کردیئے، اور پھر کچھ دنوں کے بعد کچھ لینے کا سلسلہ بالکل بند کردیا، جتنی رقم اس وقت تک دارالعلوم سے لی تھی، اس کا پورا حساب اپنے پاس محفوظ رکھا، اور اس کی واپسی کی فکر میں رہے یہاں تک کہ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جتنی تنخواہ اس عبوری دور میں دارالعلوم سے لی تھی، اس کی پائی پائی واپس کردی۔

۱۳۔ جس زمانے میں معاشی طور پر آپ کا ہاتھ تنگ رہا، اس دور میں بھی یہ بات اولاد تک پر ظاہر نہیں ہونے دی، ہم لوگوں کی صرف ضروریات ہی نہیں، جائز اور معتدل شوق بھی پورے فرماتے رہے، لیکن ساتھ ہی فضول خرچی سے اجتناب کی بھی عادت ڈالی، اور اس

بات پر ہمیشہ نگاہ رکھی کہ دنیا طلبی ہی زندگی کا مقصد ہو کر نہ رہ جائے' اپنی اولاد سے خطاب کرتے ہوئے بارہا ارشاد فرمایا کہ "میں تم لوگوں کے لئے ہمیشہ یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ معاشی پریشانی و بد حالی سے تو محفوظ رکھے' لیکن بہت زیادہ مالدار بھی نہ بنائے' کیونکہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔"

۱۱۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ اللہ والے دنیا کے تمام کاروبار عام انسانوں کی طرح انجام دیتے ہیں' لیکن دنیا کی محبت ان کے دل میں نہیں ہوتی' اس جملے کی مکمل عملی تفسیر ہم نے اپنے والد ماجدؒ کی زندگی میں دیکھی' آپ کو اللہ تعالیٰ نے کسب معاش کے لئے تجارت' زراعت اور اجارہ تینوں سمتوں پر عمل کی توفیق بخشی' تجارت اس طرح کی کہ صرف پانچ روپے کے سرمائے سے دار الاشاعت کا کام شروع کیا' جو کتابوں کی نشرو اشاعت کی شکل اختیار کرگیا' زراعت اس طرح فرمائی کہ دیوبند میں باغ لگایا' اس کے علاوہ کتابت اور جلد سازی کا بھی کام کیا' اور تنگ دستی سے لے کر وسعت و فراخی تک ہر قسم کے سرد و گرم چکھے' لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی محبت آپ کو چھو کر بھی نہیں گئی۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ دیوبند میں عمر کا بیشتر حصہ آپ نے ایک تنگ کمرے میں گذارا' آخر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی تو خود اپنے شوق سے ایک کشادہ مکان بنوایا' اس کی ایک ایک اینٹ پر محنت خرچ کی' یہاں تک کہ وہ آپ کی راحت کا بہترین سامان بن گیا' آپ کو شجر کاری کا بھی شوق تھا' اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر نیت صحیح ہو تو درخت لگانا بھی ایک صدقہ جاریہ ہے' جب تک وہ درخت قائم رہے گا' اس سے جتنے آدمی فائدہ اٹھائیں گے' درخت لگانے والے کو ثواب ملے گا' چنانچہ دیوبند ہی میں ایک باغ لگایا جس میں بڑے شوق اور محنت سے مختلف پھلوں' بالخصوص آم کے درخت جمع کئے' لیکن اس اثناء میں پاکستان بن گیا' اور ہجرت کا مرحلہ اس وقت آیا جب اس باغ پر پہلا پہلا پھل آرہا تھا' آپ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے آئے اور اکثر تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ : " بفضلہ تعالیٰ جس روز میں نے اس گھر اور اس باغ سے قدم نکالا ہے' وہ گھر اور باغ میرے دل سے نکل گئے' اور اب مجھے بعض اوقات سوچ کر بھی اس گھر کے بعض حصوں کا نقشہ یاد نہیں آتا۔" چنانچہ ساری عمر کبھی ایک مرتبہ آپ کو اس گھر یا باغ کا حسرت سے تذکرہ کرتے نہیں دیکھا۔

اسی طرح کراچی آنے کے سات سال بعد اللہ تعالیٰ نے لسبیلہ ہاؤس میں وسیع اور

آرام دہ مکان عطا فرمایا لیکن چند سال اس میں مقیم رہنے کے بعد دارالعلوم کی ضرورت داعی ہوئی کہ اپنا قیام یہاں منتقل فرمالیں، چنانچہ اس کشادہ اور آرام دہ مکان کو چھوڑ کر یہاں تشریف لے آئے، اور ایک ایسے تنگ مکان میں سال ہا سال گزارہ کیا جس کی چھتیں ناپختہ تھیں، اور برسات کے موسم میں کمرہ بری طرح ٹپکتا تھا، لیکن یہاں آنے کے بعد لسبیلہ کے مکان کے راحت و آرام کو یاد کرتے کبھی نہیں دیکھا۔

غرض دنیا کی کسی بڑی سی بڑی منفعت کے ہاتھ سے نکل جانے پر کبھی حسرت کرتے آپ کو نہیں پایا، اور بہادر شاہ ظفر مرحوم کا یہ شعر جو آپ ایسے مواقع پر اکثر پڑھا کرتے تھے، آپ کے قلب کی کیفیت کی تصویر تھا۔

یہ کہاں کا فسانہ سود و زیاں، جو گیا سو گیا، جو ملا سو ملا
کہو دل سے کہ فرصت عمر ہے کم، جو دلا تو خدا ہی کی یاد دلا

۱۵۔ ایک طرف دنیا کی بے وقعتی کا یہ استحضار تھا، لیکن دوسری طرف یہ پہلو کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہوا کہ دنیا میں جو چیز جائز اور حلال طریقے سے میسر آجائے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس کا یہ حق ہے کہ اس کی ناقدری نہ کی جائے، چنانچہ آپ اپنی مملوک اشیاء کو حفاظت کے ساتھ رکھتے، اور اس بات کی کوشش کرتے کہ کوئی چیز ضائع نہ ہونے پائے، بلکہ کسی نہ کسی کے کام آجائے۔ کاغذوں کے جو ٹکڑے تحریر سے بچ رہتے، انہیں احتیاط سے جمع کرتے رہتے، ان کی ایک جگہ مقرر تھی، اور گھر میں جب کبھی کسی کو کوئی مختصر پرچہ لکھنا ہوتا، وہاں پہنچ جاتا، وہاں ہر سائز کے کاغذ کے پرزے مل جاتے تھے۔ جو پیکٹ ڈاک میں آتے ان کی سُتلی کو ضائع کرنے کے بجائے ایک مخصوص جگہ پر رکھوا دیتے، اور گھر کا ہر فرد ضرورت کے وقت وہاں سے سُتلی لے کر استعمال کرتا۔ دعوتوں کے جو کارڈ آیا کرتے، کبھی ان کی پشت پر کوئی کلمۂ حکمت اور کبھی کوئی شعر وغیرہ لکھ کر اسے کہیں لٹکا دیتے، یا کسی کو دے دیتے۔ اگر کوئی چیز کبھی گم ہو جاتی تو اسے اجمالی طور پر تلاش ضرور کرتے، خواہ وہ ایک پائی ہی کیوں نہ ہو، اور فرماتے تھے کہ یہ بڑی ناقدری کی بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی اس عطا سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھ کر اسے تلاش ہی نہ کرے۔

انفاق فی سبیل اللہ

۱۶۔ حضرت والد صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا بڑا ذوق تھا' اور آپ مصارف خیر میں حصہ لینے کی تلاش میں رہتے تھے' چنانچہ مصارف خیر کی جتنی صورتیں عام طور سے ہوتی ہیں' ان میں سے شاید ہی کوئی صورت ایسی بچی ہو جس پر آپ نے عمل نہ فرمایا ہو' انفاق کا یہ معمول تنگی و فراخی ہر حالت میں جاری رہا' اور اس کے لئے جو طریق کار اختیار فرمایا ہوا تھا وہ بڑا سبق آموز اور لائق تقلید ہے۔

آپ کا یہ معمول تھا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے علاوہ آپ کے پاس جب بھی کوئی رقم آتی تو اس کا ایک معین حصہ فوراً مصارف خیر میں خرچ کرنے کے لئے علیحدہ فرمالیتے تھے' اور طے یہ کیا ہوا تھا کہ آمدنی اگر محنت سے حاصل ہوئی ہے تو اس کا بیسواں حصہ (پانچ فیصد) اور اگر کسی محنت کے بغیر حاصل ہوئی ہے (مثلاً انعام' ہدیہ' تحفہ وغیرہ) تو اس کا دسواں حصہ فوراً علیحدہ نکال لیا جائے۔

جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں' آپ کے پاس ہمیشہ ہر قسم کے اخراجات کی الگ الگ مدیں مقرر تھیں' ایک صندوقچی میں مختلف تھیلے یا لفافے رکھے رہتے تھے' جن پر اس مد کا نام درج ہوتا تھا مثلاً "خانگی اخراجات" "آمدورفت کے اخراجات" وغیرہ' اسی صندوقچی میں ایک تھیلا آپ کے پاس ہمیشہ رہتا تھا جس پر "صدقات و مبرآت" لکھا رہتا تھا۔ تنگ دستی کا زمانہ ہو یا فراخی کا آمدنی کا مذکورہ حصہ آپ فوراً اس تھیلے میں رکھ دیتے تھے اور جب تک یہ حصہ "صدقات و مبرات" کے تھیلی میں نہ چلا جاتا' اس وقت تک اس آمدنی کو استعمال نہیں فرماتے تھے۔ اگر دس روپے بھی کہیں سے آئے ہیں تو فوراً اس کے چھوٹے نوٹ بدلوا کر ایک روپیہ اس تھیلے میں رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔

فرمایا کرتے تھے کہ اس طریق کار کی برکت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی خیرات کا مصرف سامنے آتا ہے تو اس وقت سوچنا نہیں پڑتا کہ اس میں رقم کہاں سے دی جائے؟ بلکہ یہ صدقات و مبرآت کا تھیلہ ہر وقت یاد دہانی کراتا رہتا ہے کہ اس کا کوئی مصرف تلاش کیا جائے۔

دوسری طرف آپ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جو کسی کے سامنے دست

سوال دراز نہیں کرتے، لیکن ضرورت مند ہیں، اور اس قسم کے افراد کی ایک فہرست ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے۔ آمدنی کا دسواں اور بیسواں حصہ تو ایک معین مقدار تھی، اس کے علاوہ بھی جب موقع ملتا اس تھیلے میں مزید رقمیں شامل فرمادیتے، اس طرح ہم نے کبھی اس تھیلے کو خالی نہیں دیکھا، اس کے ذریعے کتنے انسانوں کی حاجت روائی ہوئی، اور کتنے مصارف خیر جاری ہوئے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، نہ جانے کتنوں کا ماہانہ وظیفہ مقرر تھا، کتنے افراد کو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کراکر معاشی ترقی کے راستے پر لگادیا، کتنے افراد کی رہائش کا انتظام فرمادیا، اور کتنے افراد کی کسی دوسری طرح ضروریات پوری کرنے میں مدد دی۔

روپیہ خرچ کردینا تو پھر بھی نسبتۃً آسان ہوتا ہے، لیکن ایسے مصروف انسان کے لئے یہ بات بے حد مشکل ہوتی ہے کہ خود جاجا کر لوگوں کی براہ راست خبر گیری کرے، اور اپنی نگرانی میں ان سے کام کرائے، حضرت والد صاحبؒ کا معمول یہی تھا کہ وہ اپنے متعلقین اور رشتہ داروں میں خود جاکر ان کی ضرورتیں معلوم فرماتے، اور ان کی ضروریات پوری کرنے میں روپے کے علاوہ وقت اور محنت بھی صرف فرماتے تھے، اور اس معاملے میں قریب اور دور کی رشتہ داری کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا، ہندوستان کے دور دراز گاؤں میں کوئی دور پرے کا رشتہ دار آباد ہے تو اس کے حالات سے بھی باخبر رہتے۔ ایک ایسے ہی گاؤں میں ایک بیوہ خاتون تھیں، آپ کو پتہ چلا کہ ان کا مکان برسات میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، اس زمانے میں ایک تو ہندوستان روپیہ بھیجنا کارے دارد تھا، دوسرے حسب عادت صرف روپیہ بھیجنے سے حضرتؒ کی تسلی نہ ہوئی، کیونکہ خاتون کے لئے خود مکان کی مرمت کرانا دشوار تھا، لیکن آپ نے نہ جانے کس کس طرح دوسرے ملکوں کی معرفت روپیہ ایک دوسرے صاحب کو بھجوایا، اور ان کے ذریعے مکان کی مرمت کرائی۔

۱۷۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ روپیہ اپنے پاس سے نکال دیا جائے، بلکہ اس کو صحیح مصرف تک پہنچانا بھی انسان کی اپنی ذمہ داری ہے، اسی لئے حکم یہ نہیں ہے کہ "زکوٰۃ نکالو" بلکہ حکم یہ ہے کہ "زکوٰۃ ادا کرو۔" لہٰذا لوگوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہوا ہے کہ زکوٰۃ نکال کر جس کو چاہا پکڑادی، اس سے ذمہ داری پوری نہیں ہوتی، بلکہ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ایسے مستحقین کی ایک فہرست نگاہ میں رکھے جو کسی سے مانگتے نہیں، لیکن ضرورت مند ہیں۔

۱۸۔ بازار میں جو بھکاری عام طور پر مانگتے پھرتے ہیں، ان کے ساتھ بھی والد صاحبؒ کا عجیب طرزِ عمل تھا، عام طور پر جو کوئی سائل آتا، آپ اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے، ایک مرتبہ احقر موٹر میں آپ کے ساتھ تھا، کسی جگہ گاڑی رکی، اور ایک سائل آدھمکا، آپ نے اپنی جیب میں سے کچھ نکال کر اسے دے دیا، احقر نے پوچھا کہ "اباجی" اس قسم کے سائل عام طور سے مستحق تو ہوتے نہیں، ان کو دینا چاہئے یا نہیں؟" اس کا جو عجیب و غریب جواب آپ نے دیا، وہ آج تک لوحِ دل پر نقش ہے، فرمایا! "ہاں میاں! بات تو ٹھیک ہے، لیکن یہ سوچو کہ اگر ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے استحقاق ہی کی بنیاد پر ملنے لگے تو ہمارا کیا بنے گا""؟

حضرتؒ کے اس جواب سے واقعۃً رونگٹے کھڑے ہوگئے، اور اندازہ ہوا کہ اللہ والوں کی نظریں کہاں پہنچتی ہیں؟ مگر ساتھ ہی یہ شبہ رہا کہ جس شخص کے لئے سوال کرنا حلال نہیں، فقہاء کرامؒ نے اسے دینے کو بھی منع کیا ہے، چنانچہ کچھ وقفے کے بعد احقر نے فقہاءؒ کے اس قول کے حوالے سے دوبارہ مسئلہ پوچھا تو اس پر فرمایا :

"جس شخص کے بارے میں یقین سے معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس اتنے پیسے موجود ہیں کہ اس کے لئے سوال کرنا حلال نہیں، یہ حکم اس کے لئے ہے کہ اسے نہ دیا جائے، اور یہ حکم بھی اس لئے نہیں کہ وہ مستحق نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ اس کی عادت خراب ہوگی، لیکن سڑک پر جو اجنبی سائل سامنے آجاتے ہیں، ان کے بارے میں یقین سے یہ بات کہاں معلوم ہوتی ہے؟ اور محض بدگمانی کی بناء پر کسی سائل کو رد کرنا ٹھیک نہیں، ہاں جس جگہ یقین سے معلوم ہو جائے کہ یہ دھوکہ کر رہا ہے اور اس کے لئے مانگنا جائز نہیں تو وہاں بے شک نہیں دینا چاہئے۔"

حضرت والد صاحبؒ کے اس جواب سے ایک بہت بڑی الجھن رفع ہوگئی، اور راہِ عمل واضح ہوگئی۔

۱۹۔ غرباء کی امداد کے علاوہ آپ کو صدقہ جاریہ کا خاص ذوق تھا، جب کسی مسجد کی تعمیر کی خبر سنتے تو اس میں کچھ نہ کچھ حصہ لینے کی کوشش فرماتے۔ دارالعلوم میں دو کمرے اس مقصد کے لئے اپنے خرچ سے تعمیر کرائے اور انہیں مسجد پر وقف کر دیا، اپنے والدین کے لئے متعدد صدقات جاریہ میں رقمیں لگائیں، دارالعلوم کے کتب خانے میں بہت سی کتابیں وقف

فرمائیں، یہاں تک کہ اپنا ذاتی کتب خانہ بھی وقف فرماگئے، جو کم از کم ایک لاکھ روپے کی مالیت کی کتابوں پر مشتمل ہوگا۔

معاملات کی صفائی

۲۰۔ حضرت والد صاحبؒ کو معاملات کی صفائی کا بے حد اہتمام تھا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ بددیانتی سے کسی کے حق کو غصب کرلینا تو گناہ عظیم ہے ہی، حسابات و معاملات کو مجمل، مبہم یا مشتبہ رکھنا بھی بہت خطرناک غلطی ہے جس کا نتیجہ بعض اوقات بددیانتی ہی کی شکل میں نکلتا ہے۔ بعض لوگوں کی نیت بددیانتی کی نہیں ہوتی، لیکن معاملات کے گڈمڈ ہونے کے وجہ سے بہت سے گناہوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ خاص طور پر باپ بیٹوں، بہن بھائیوں، استاد و شاگرد، شیخ و مرید اور بے تکلف تعلقات میں اس قسم کی صورتیں بکثرت پیش آتی ہیں، مثلاً باپ بیٹوں نے مل جل کر ایک مکان بنوالیا، اور حساب کچھ نہ رکھا کہ کس نے کتنی رقم خرچ کی ہے، اور یہ بات بھی واضح نہ کی کہ مکان کس کی ملکیت ہوگا اور اس طرح معاملات کو مبہم رکھ کر مکان میں رہتے بستے رہے، شروع میں تو بظاہر اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی، لیکن آگے چل کر جب مکان کی تقسیم یا وراثت کا سوال آتا ہے تو آپس میں شدید جھگڑے اٹھتے ہیں اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچتی ہے۔

حضرت والد صاحبؒ کا معمول ساری عمر یہ رہا کہ معاملہ بیٹے سے ہو یا بھائی سے، دوست سے ہو یا رشتہ دار سے، شاگرد سے ہو یا مرید سے ہمیشہ واضح، غیر مشتبہ اور عموماً تحریری شکل میں فرماتے تھے۔ اور آخر تک کی بات پہلے ہی طے فرمالیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اگر اپنے بیٹوں سے کوئی لین دین ہوتا تو اس کی حیثیت بھی عام طور سے لکھ کر معین فرمادیتے، ایک مرتبہ آپ نے کچھ کتابیں ہمارے مرحوم بھائی مولانا محمد زکی کیفی صاحب مرحوم کو فروخت کیں، انہوں نے رقم بھیجی جو شاید چند سو روپے تھی تو آپ نے باقاعدہ اس کی تحریری رسید الگ کاغذ پر بنا کر بھیجی کہ اتنے روپے فلاں فلاں کتابوں کے عوض میں مولوی محمد زکی سلمہ سے وصول پائے، غرض حدیث میں جو ارشاد ہے کہ

تعاشروا کالاخوان وتعاملوا کالاجانب

"رہو بھائیوں کی طرح، مگر معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔"

اس ارشاد گرامی پر جس اہتمام کے ساتھ حضرت والد صاحبؒ کو عمل کرتے دیکھا' اس کی نظیر کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی۔

آپ اپنے روپے پیسے کے حسابات ہر وقت بالکل مکمل اور تازہ ترین صورت حال کے مطابق رکھتے تھے' آپ کی صندوقچی میں بہت سی امانتیں رہتی تھیں اور ذاتی رقوم کی بھی مختلف مدات تھے۔ لیکن ہر مد بالکل واضح اور اس پر لکھی ہوئی ہدایات قطعی طور پر غیر مشتبہ ہوتی تھیں' آپ فرمایا کرتے تھے کہ بحمد اللہ میرے تمام معاملات ہر وقت اتنے واضح رہتے ہیں کہ اگر ابھی دنیا سے اٹھ جاؤں تو کسی ایسے معاملے کا دل پر بوجھ نہیں ہوگا جو لکھا ہوا نہ ہو' اور کسی بھی شخص کو اس کے سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ چنانچہ یہی ہوا بھی کہ آپ کی وفات کے بعد صندوقچی میں دسیوں قسم کے مدات' امانتیں اور حسابات برآمد ہوئے' لیکن ہر ایک اتنا واضح کہ ہم لوگوں کو انہیں حق دار تک پہنچانے میں ادنیٰ دشواری نہیں ہوئی۔

آپ نے اپنا وصیت نامہ اس وقت سے لکھنا شروع کردیا تھا جب آپ کی عمر کل تیس سال تھی۔ اور اس میں اپنی تمام املاک اور امانتوں کے بارے میں وضاحت کے ساتھ پوری تفصیل درج فرمادی تھی' اور پھر جوں جوں املاک اور امانتوں میں تغیر آتا رہتا' اس وصیت نامے کو بدلتے رہتے یہاں تک کہ وہ ایک ضخیم رجسٹر بن گیا' اور آخر عمر میں سابقہ تمام وصیت ناموں کو منسوخ فرما کر نیا وصیت نامہ تحریر فرمایا جس میں اپنی ایک ایک ملکیت کی پوری حقیقت واضح فرمادی' آپ نے جو ذاتی مکان تعمیر فرمایا تھا' اسے تو خود اپنی زندگی ہی میں اپنے ہونے والے ورثاء کے درمیان تقسیم کرکے ہر ایک کے نام ہبہ نامے الگ الگ رجسٹری کرادیئے تھے' اور ہر ایک کو اس کا حصہ حوالہ کرکے فارغ ہوگئے تھے۔ لیکن دوسری چیزوں کے بارے میں بھی ہر بات وصیت نامے میں واضح فرمادی تھی' اور اس میں یہاں تک تحریر فرمادیا تھا کہ گھر کے سامان میں کتنا حصہ ان کی ملکیت ہے جو ترکے میں شامل ہو کر تقسیم ہوگا' اور کتنا والدہ صاحبہ مدظلہا کی ملکیت ہے جو ان کے تصرف میں رہے گا۔

آخر عمر میں جب صاحب فراش ہوگئے تھے تو دارالعلوم کے انتظامی امور بھی چارپائی پر ہی انجام دیتے تھے' لیکن اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ دارالعلوم کی کوئی چیز کمرے میں نہ رہنے پائے' فرنیچر اور برتنوں سے لے کر قلم دوات کاغذ اور آل پن تک کوئی مدرسے کی چیز

کمرے میں نہ آنے دیتے' اور اگر کبھی کوئی چیز آجاتی تو فوراً اسے واپس بھیجنے کا انتظام فرماتے۔ وجہ یہ تھی کہ وصیت نامے میں آپ نے لکھ دیا تھا کہ اس کمرے کا جتنا سامان ہے وہ میری ملکیت ہے' ادھر ہر وقت آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوے کے انتظار میں تھے' اس لئے یہ خطرہ تھا کہ اگر انتقال کے وقت مدرسے کی کوئی چیز کمرے میں پڑی رہ گئی تو اسے ذاتی ملکیت سمجھ کر ترکے میں شامل نہ کرلیا جائے بلکہ اس بات کا اہتمام بھی فرماتے تھے کہ والدہ صاحبہ مدظلہا یا ہمارے کمروں میں سے کسی کی کوئی چیز یہاں نہ پڑی رہے' جو چیز وقتی طور پر آتی' اسے فوراً واپس بھیج دیتے' شاید اس کی وجہ بھی یہی ہو کہ وصیت نامے کے مطابق صرف آپ کے دو کمروں کا سامان آپ کی ملکیت میں تھا' باقی گھریلو سامان آپ والدہ صاحبہ کو ہبہ فرما چکے تھے۔

دوسروں کے جذبات کی رعایت

۲۱۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوسروں کے جذبات کی رعایت کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ہر شخص سے اس کے مزاج و مذاق اور اس کی ضروریات کے مطابق معاملہ فرماتے' اور اپنی ہر نقل و حرکت میں اس بات کا خیال رکھتے کہ کسی دوسرے کو آپ کی ذات سے تکلیف نہ پہنچے' کسی کے یہاں جانا ہوتا تو پہلے سے معلوم فرماتے کہ کون سے وقت اس کے لئے ملاقات آسان ہوگی' اگر کھانے کا وقت قریب ہوتا اور وہاں کھانے کا ارادہ نہ ہوتا تو جاتے ہی مناسب انداز میں اس پر واضح فرمادیتے کہ اس کے یہاں کھانے کا ارادہ نہیں ہے' ایسا نہ ہو کہ وہ کھانے کا انتظام کرے اور بعد میں تکلیف ہو' کسی کے یہاں کھانے کا ارادہ ہوتا تو اتنا پہلے اسے باخبر فرماتے کہ وہ بآسانی انتظام کرسکے۔ کسی کو ٹیلیفون کرتے وقت اس بات کی رعایت فرماتے کہ اس کے لئے اس وقت فون پر آنا مشکل نہ ہو۔

کسی شخص پر اس کے مزاج کے خلاف اصرار کرنے یا دباؤ ڈالنے کا تو دستور ہی نہ تھا' کسی کی سفارش کرنے سے پہلے بار بار سوچتے تھے کہ جس شخص سے سفارش کی جارہی ہے اس کی طبیعت پر بار تو نہیں ہوگا اور سفارش کرتے وقت بھی اس پر دباؤ ڈالنے کے بجائے یہ فرماتے کہ اگر قواعد و ضوابط میں گنجائش ہو اور آپ کی وسعت میں ہو تو فلاں کام کردیجئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ کسی ایک شخص کی حاجت برآری کے لئے دوسرے شخص کو ناجائز کام پر

آمادہ کرنا یا اس کو اصول توڑنے پر مجبور کرنا یا اسکی طبیعت پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنا مجھے گوارا نہیں۔

جتنا کام آپ کے لئے اپنے ہاتھ سے کرنا ممکن ہوتا' عموماً اس کے لئے دوسرے شخص کو تکلیف نہیں دیتے تھے' بارہا اپنے کمرے کی خود جھاڑو دے لیتے' کبھی کبھی کپڑے بھی خود دھو لیتے' درختوں کو اپنے ہاتھ سے پانی دے لیتے' مہمانوں کے لئے خود دستر خوان بچھا کر خود کھانا لے آتے' غرض اپنے کسی کام سے نہ صرف یہ کہ کوئی اعراض نہیں تھا' بلکہ اتباع سنت کی نیت سے اس قسم کے کاموں کا شوق تھا' اور جب تک صحت رہی معمول یہی رہا کہ اگر ہم لوگوں کو کسی اور کام میں مشغول دیکھا تو ہمیں بلانے کے بجائے خود اپنے ہاتھ سے یہ کام انجام دے لئے۔

یہ عادت اس قدر راسخ ہو چکی تھی کہ مرض وفات میں شدید بیماری کے دوران بھی جتنا کام خود کرنا بس میں ہوتا' ہماری بار بار کی التجاؤں کے باوجود خود ہی کرتے تھے۔

آپ کی تمام ضروریات کی ایک جگہ مقرر تھی' اور کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو جگہ مقرر ہونے کی بنا پر وہ اندھیرے میں بھی مل جاتی' جب کبھی کوئی چیز اسکی جگہ سے اٹھائی' ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً وہیں رکھ دی' اس عادت میں کبھی تخلّف نہیں ہوتا تھا' ہم لوگ اپنی بد نظمی سے حضرتؒ کو بڑی تکلیف پہنچاتے تھے کہ کوئی چیز اس کی جگہ سے اٹھائی' اور دوسری جگہ رکھ دی' اس پر کئی بار ہمیں تنبیہہ فرمائی' اور ایک دن فرمایا کہ "لوگوں نے ان آداب معاشرت کو دین سے خارج ہی سمجھ لیا ہے' اور ان باتوں کی پروا نہیں کرتے' حالانکہ مشترک استعمال کی چیزوں کی جو جگہ مقرر ہو اسے وہاں سے بے جگہ لے جانا صرف مروّت اور اخلاق ہی کے خلاف نہیں' اس لحاظ سے بڑا گناہ بھی ہے کہ ضرورت کے وقت چیز اپنی جگہ پر نہیں ملتی تو اس سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اور کسی مسلمان کو ایذا پہنچانا بہت بڑا گناہ ہے۔"

ملازموں سے کام لینے میں بھی اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے کہ وہ ان کے لئے زیادہ مشقت کا موجب نہ ہو' ان کے آرام کے اوقات میں کام بتانے سے پرہیز فرماتے' کسی جگہ رات کو جانا ہوتا تو اس بنا پر جلدی واپس لوٹنے کی کوشش فرماتے کہ ڈرائیور کو رات کے وقت زیادہ جاگنا نہ پڑے۔ ایک ساتھ بہت سے کام بتلا کر ملازم کے ذہن پر بار نہ ڈالتے' بلکہ

جب وہ ایک کام سے فارغ ہو جاتا تو دوسرا بتاتے، غرض آپ کی پوری زندگی اس شعر کی عملی تشریح تھی جو آپ اکثر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

تمام عمر اسی اہتمام میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

اور اس فکر کی انتہا یہ ہے کہ وفات سے دس روز پہلے جو رمضان کا مہینہ ختم ہوا، اس میں وقتاً فوقتاً آپ کی طبیعت بگڑنے لگتی تھی، دل کی تکلیف بار بار ہونے لگی تھی، جب یہ رمضان المبارک ختم ہو گیا تو ایک دن حسرت کے ساتھ فرمانے لگے کہ :

"اس رمضان میں جب میری طبیعت بار بار خراب ہوتی تو بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ مجھے اس مبارک مہینے کی موت کی سعادت عطا فرمادیں، لیکن میرا بھی عجیب حال ہے، اس خیال کے باوجود میں اس بات کی تمنا اور دعا نہ کر سکا کہ میرا انتقال رمضان میں ہو، کیونکہ مجھے خیال یہ تھا کہ اگر یہ واقعہ رمضان میں پیش آیا تو "اوپر والوں کو" (یعنی تجہیز و تکفین کے منتظمین اور اس میں شرکت کرنے والوں کو) بہت تکلیف ہوگی۔"

میں حضرتؒ کی زبان سے یہ جملے سن رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ ان کی پروازِ فکر ہمارے تخیل و تصور کی ہر سرحد سے کتنی بلند ہے... اللہ اکبر!

اسی مرضِ وفات کے دوران چونکہ طبیعت بے حد کمزور ہو گئی تھی، اس لئے ذرا مزاج کے خلاف کوئی بات ہوتی تو طبیعت میں تغیر آجاتا تھا، ادھر غنودگی لانے والی دواؤں کی بناء پر بعض اوقات سوچنے کا انداز اپنی طبعی حالت پر نہیں رہتا تھا، اس لئے اپنی عام عادت کے خلاف لہجے میں تلخی جلد آنے لگی تھی، ایک دن آپ نے احقر سے فرمایا :

"بعض اوقات میں تم لوگوں کو ایسی بات پر تنبیہ کرتا ہوں جو واقعۃً قابلِ تنبیہ ہوتی ہے لیکن بعض اوقات لہجے میں تلخی کی وجہ ضعف اور علالت بھی ہوتی ہے، تم لوگوں کو ان دونوں میں امتیاز کرنا چاہئے، اور اس بات پر رنجیدہ نہ ہونا چاہئے کہ لہجے کی تلخی بڑھتی جارہی ہے۔"

کیا ٹھکانہ ہے اعتدالِ فکر و مزاج اور دوسروں کی رعایت کا! ایسی حالت میں بھی جبکہ

طبیعت کا غیر طبعی حالت پر ہونا ہر کس و ناکس پر عیاں ہے' خود اپنے انداز گفتگو کا تجزیہ جاری ہے اور دوسروں کی رنجیدگی کا خیال اس حالت میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اعتدال و توازن میں ڈھلی ہوئی اس زندگی کی مثال اب نگاہوں کو کہاں نصیب ہوگی؟ یہی تو وہ باتیں ہیں جنہیں یاد کر کے بے ساختہ یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

همه شهر پُر زخوباں' منم و جمال ماہے
چه کنم که چشم خوش بیں نه کند بکس نگاہے

جھگڑوں سے اجتناب

۲۲۔ حضرت والد صاحبؒ کو جھگڑوں' تنازعات اور نزاع و جدال سے طبعاً نفرت تھی' اور جب تک کوئی واقعی دینی ضرورت داعی نہ ہو' آپ اپنے حق کے لئے بھی کبھی جھگڑوں میں پڑنا پسند نہیں فرماتے تھے' نہ جانے زندگی میں کتنے مواقع ایسے آئے کہ آپ نے تنازعات سے بچنے کے لئے اپنا جائز اور قیمتی سے قیمتی حق چھوڑ دیا۔ اس سلسلے میں آپ ایک حدیث اکثر سنایا کرتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

انا زعیم ببیت فی وسط الجنة لمن ترك المراء وهو محق (اوکما قال)
"میں اس شخص کے لئے جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کی ضمانت لیتا ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے۔"

اس حدیث پر عمل کی حیرت انگیز مثال یہ واقعہ ہے کہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے قریب (جہاں آج کل اسلامیہ کالج ہے) آپ کو دارالعلوم کے لئے ایک وسیع قطعہ زمین مل چکا تھا' لیکن آپ نے جھگڑے سے بچنے کے لئے اسے چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل احقر کے شیخ و مربی حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی مد ظلہم العالی کے مضمون میں آچکی ہے۔

اس کے علاوہ آپ کے ذاتی معاملات میں نہ جانے کتنے لوگوں نے آپ کو دھوکے دیئے' کتنوں نے آپ پر مقدمات قائم کرنا چاہے' کتنوں نے بدنام کرنے کے لئے اخبار و اشتہار کا سہارا لیا' لیکن آپ نے ان تمام باتوں کا وہ جواب نہیں دیا جو آج کی دنیا دیتی ہے' بلکہ اکثر اپنا حق چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

علمی اختلاف ہو یا دوسرے مکاتب فکر سے بحث و مباحثہ، آپ اسے نزاع و جدال کی حد تک پہنچانے سے حتی الوسع روکتے تھے، اور کسی بزرگ (شاید امام زہریؒ) کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے "المراء یذھب بنور العلم" یعنی "جھگڑوں سے علم کا نور جاتا رہتا ہے۔"

دارالعلوم کا خصوصی مزاج

۲۳۔ آپ نے دارالعلوم کراچی قائم فرمایا تو اسے شروع ہی سے ایک خاص مزاج میں ڈھالنے کے لئے غیر معمولی ذہنی اور علمی محنت اٹھائی۔ آپ کی تمام کوشش کا محور یہ تھا کہ یہ ادارہ ان اکابر دیوبند کے اصلی مزاج ومذاق کی تصویر ہو جنہوں نے آخری دور میں صدق و اخلاص، تواضع و للّٰہیت اور توسط و اعتدال کی انمٹ مثالیں قائم فرمائی ہیں۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ ادارہ نمود و نمائش کے رسمی مظاہروں اور شور و شر سے الگ رہ کر خاموشی سے دین کے مخلص خادم پیدا کرنے میں لگا رہے، یہاں ایسے اللہ والے جمع ہوں جو اخلاص اور سلامت فکر کے ساتھ دین کی صحیح خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں۔

چونکہ آپ کو مدارس کی زندگی کا طویل تجربہ تھا، اس لئے آپ نے یہاں کے نظم ونسق میں بہت سے ایسے اصول مقرر فرمائے جو دوسرے مدارس کے مقابلے میں بعض اوقات اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کی افادیت روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ نے یہاں "صدر مدرّس" یا "شیخ الحدیث" کا کوئی منصب نہیں رکھا، بلکہ تمام اساتذہ مل جل کر کام کرتے ہیں، اسی طرح آپ نے یہاں شروع سے یہ پرداز ڈالا ہے کہ کوئی شخص انفرادی طور پر کوئی شکایت یا مطالبہ پیش کرے تو اس پر فوراً ہمدردی سے غور کرکے شکایت کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن اجتماعی طور پر کوئی مطالبہ کرنے یا جتھے بنا کر شکایات پیش کرنے کی ہمیشہ ہمت شکنی فرمائی۔ نیز آپ نے محض طلباء کی تعداد بڑھانے کے لئے کوئی اقدام کبھی نہیں کیا، بلکہ جو اقدام کیا دیانت داری سے یہ دیکھ کر کیا کہ وہ مدرسہ کے مقاصد سے کس حد تک ہم آہنگ ہے اس لئے جن مشہور مدرسین کی شہرت طلباء کے لئے باعث کشش ہو سکتی ہے، ان کو جمع کرنے کے لئے کبھی اصول صحیحہ کو قربان نہیں کیا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو استاذ کسی مدرسے میں پڑھا رہا ہے، اسے وہاں پڑھانے کے دوران اپنے مدرسے میں آنے کی دعوت دینا اصول کے خلاف ہے، اول تو اس میں "سوم علی سوم اخیہ"

کا گناہ ہے۔ دوسرے ایک مدرسے کو اجاڑ کر دوسرا مدرسہ آباد کرنا دین کی کوئی خدمت نہیں۔ہاں اگر یہ معلوم ہوجاتا کہ کوئی صاحب اس مدرسے سے الگ ہوگئے ہیں یا الگ ہونے کا ارادہ ہے تو ان سے زیادہ سے زیادہ جو بات فرماتے وہ یہ تھی کہ "اگر آپ اس مدرسے کو خود چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہوں تو دارالعلوم حاضر ہے"

دارالعلوم کے چندے کے لئے آپ عمر بھر کبھی کسی کے پاس تشریف نہیں لے گئے' کم آمدنی والے حضرات کے چندے کی آپ زیادہ قدر فرماتے' اور اسے باعث برکت قرار دیتے' جو تاجر حضرات اخلاص کے ساتھ خدمت دین کی نیت سے دارالعلوم کی اعانت میں حصہ لیتے ان کی ہمت افزائی فرماتے' لیکن جن صاحب کے چندے میں احسان جتلانے کا کوئی شائبہ نظر آتا ان کا چندہ قبول کرنے سے خوش اخلاقی کے ساتھ معذرت فرمالیتے' اور اگر کسی صاحب کے بارے میں کبھی یہ معلوم ہوجاتا کہ انہوں نے اپنے چندے کے زعم میں دارالعلوم کے کسی فرد کے ساتھ کوئی اہانت آمیز رویہ اختیار کیا ہے تو یہ بات آپ کے لئے قطعاً ناقابل برداشت ہوتی' اور موقع ملنے پر ان صاحب کا ٹھیک ٹھیک علاج فرمادیتے' اور اس معاملے میں کبھی کسی بڑے سے بڑے ذی وجاہت شخص کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو استغناء کی دولت سے نوازا تھا' لیکن یہ استغناء کبھی بد اخلاقی کی حدود میں داخل نہیں ہوا' چنانچہ آپ ہر شخص کا مناسب اکرام بھی فرماتے' اور جن صاحب کا چندہ آپ کو مدرسے کے لئے مناسب معلوم نہ ہوتا اسے ایسی طرح رد فرماتے کہ جس سے ان کی بلاوجہ دل شکنی بھی نہ ہو' جن بے تکلف اور مخلص احباب کے بارے میں اندازہ ہوتا کہ وہ دارالعلوم کی کسی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں' انہیں مدرسے کی کسی ضرورت کی طرف اس طرح متوجہ بھی فرمادیتے کہ اگر ان کی وسعت میں ہو تو اس کام میں حصہ لے سکیں' لیکن طبیعت پر کوئی بار بھی نہ ہو' اور جن حضرات کے چندے میں خدشہ نظر آتا ان کے پوچھنے پر بھی مدرسے کی کسی ضرورت کا اظہار نہ فرماتے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جبکہ دارالعلوم کا تعمیری کام جاری تھا' اور اس کے لئے رقم کی ضرورت تھی' ملک کے ایک مشہور سرمایہ دار والد صاحبؒ کے پاس تشریف لائے' اور پہلے کچھ رقم بطور ہدیہ دینے کی پیش کش کی جس سے آپ نے خوبصورتی کے ساتھ معذرت فرمالی' اس کے بعد انہوں نے دارالعلوم کی تعمیرات میں مؤثر حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی'

اور وہ اس مالی حیثیت کے آدمی تھے کہ دارالعلوم کے اس وقت کے تمام تعمیری منصوبے پورے کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن حضرت والد صاحبؒ کو اپنی فراست سے اندازہ ہوگیا کہ ان کی یہ اچانک آمد اور یہ پیش کش بلاوجہ نہیں ہے، چنانچہ آپ نے اس پیش کش سے بھی یہ کہہ کر معذرت فرمالی کہ بحمد اللہ فی الحال تو مدرسے کا کام چل رہا ہے، آپ تکلیف نہ فرمائیں، چنانچہ وہ صاحب ناکام تشریف لے گئے، اور بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت والد صاحبؒ کا یہ فیصلہ کتنا صحیح تھا۔

آپ افریقہ تشریف لے گئے، وہاں لوگوں نے مختلف ہدیے تحفے بھی لانے شروع کئے اور دارالعلوم کے چندے کی بھی پیشکش کی، لیکن آپ نے یہ عام اعلان فرمادیا کہ میں یہاں دین کی کچھ باتیں سنانے کے لئے آیا ہوں، سب حضرات اس سننے کی طرف متوجہ ہوں، کوئی صاحب نہ مجھے ذاتی طور پر کوئی ہدیہ پیش کریں اور نہ دارالعلوم کے لئے یہاں چندہ دیں، جو صاحب دارالعلوم کی اعانت کرنا چاہتے ہوں، وہ براہ راست اپنی رقم دارالعلوم کراچی کے پتے پر ارسال فرمادیں، چنانچہ تقریباً دو ماہ کے اس سفر میں آپ نے ان باتوں پر سختی کے ساتھ عمل فرمایا، اور چند انتہائی بے تکلف حضرات کے سوا جن سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے، نہ کسی سے کوئی ہدیہ قبول کیا، اور نہ دارالعلوم کے لئے چندہ وصول فرمایا۔

اس اخلاص اور للّٰہیت کا ثمرہ یہ تھا کہ دو ماہ کے اس دورے نے نہ جانے کتنے انسانوں کی زندگی میں انقلاب برپا کردیا، بے نمازی لوگ نمازی بن گئے، بعض عادی قسم کے لوگوں نے ام الخبائث سے توبہ کرلی، نوجوانوں نے دین سیکھنا شروع کردیا، اور وہاں کے حضرات اب تک اس دورے کی حسین یادیں بھول نہیں پائے۔ غرض حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی وصیت کے مطابق جب تک دینی مدارس توکّل، استغناء اور للّٰہیت پر کاربند رہیں گے، ان کا کام انشاء اللہ بابرکت ہوگا، اور اہل علم سے دنیا کو فائدہ پہنچے گا، لیکن جب اہل علم بھی توکّل اور استغناء سے محروم ہو جائیں، اور اہل ثروت کی ثروت پر ان کی نگاہ جانے لگے تو ان کی تعلیم و تبلیغ بھی انوار و برکات سے خالی ہو جائے گی۔

مذکورہ بالا اصولوں کے بارے میں حضرت والد صاحبؒ نے تمام منتظمین کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ: "ہم نے دارالعلوم کی شکل میں کوئی دکان نہیں کھولی، بلکہ خدمت دین کا ایک ادارہ قائم کیا ہے، جب تک آپ حضرات اس ادارے کو صحیح اصولوں پر اور اللہ تعالیٰ

کی رضا کے مطابق چلاسکیں، چلائیں اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آجائے کہ اسے صحیح اصولوں پر چلانا ممکن نہ رہے تو میرے نزدیک اسے بند کردینا بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ اسے غلط اصولوں پر چلایا جائے۔"

تواضع وفنائیت

۲۴۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے تواضع اور فنائیت کا جو مقام عطا فرمایا تھا، وہ آپ کے اوصاف کمال میں سب سے زیادہ نمایاں وصف تھا، جس شخص نے آپ کو ایک نظر بھی دیکھ لیا، وہ آپ کے اس وصف کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "البلاغ" کی خصوصی اشاعت میں بھی جن حضرات نے آپ کے بارے میں اپنے تاثرات بیان فرمائے ہیں، ان میں سے اکثر حضرات نے اس صفت کا تذکرہ ضرور کیا ہے، اس لئے یہاں اس وصف کے کسی تفصیلی بیان کی ضرورت نہیں، البتہ جو بات یہاں قابل ذکر ہے وہ یہ کہ جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا ہے، تواضع اور چیز ہے، اور تواضع کا مظاہرہ بالکل دوسری چیز۔ تواضع کا مظاہرہ تو ہر شخص اپنی جبلت کے مطابق کچھ نہ کچھ کرہی لیتا ہے، لیکن محض اپنے آپ کو خاکسار، نیاز مند، ناچیز، ناکارہ وغیرہ کہہ دینے سے تواضع کی حقیقت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ بقول حضرت حکیم الامتؒ :

> "تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ حقیقت میں اپنے آپ کو لاشئے سمجھے، اور ہیچ سمجھ کر تواضع کرے، اپنے کو رفعت کا اہل نہ سمجھے اور سچ مچ اپنے کو مٹانے کا قصد کرے"

(بصائر حکیم الامت ۳۵۵)

اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحبؒ کو تواضع کا جو کمال عطا فرمایا تھا، وہ یہی تھا کہ علم و فضل کے دریا سینے میں جذب کرلینے کے باوجود انہیں اس بات کا ہر وقت یقین اور استحضار تھا کہ میں کسی رفعت و تعظیم کا ہرگز اہل نہیں۔

صرف ایک واقعہ مثالاً پیش کرتا ہوں۔ ساری عمر آپ کا معاملہ یہ رہا کہ ملاقاتیوں کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا، بلکہ جب کوئی آگیا، خواہ کتنے ضروری کام میں مشغول ہوں، اس سے ملاقات فرمائی، اس طرز عمل کے نتیجے میں آپ کو سخت دشواری اٹھانی پڑتی

تھی' بعض اوقات تصنیف و تالیف کے وقت لوگ پہنچ جاتے اور کام میں رکاوٹ پڑ جاتی' اور بعض مرتبہ کسی دوسرے اہم کام میں مشغول ہوتے اور کوئی شخص اپنی معمولی سی ضرورت لے کر آ جاتا تو اس کی ضرورت پوری فرمانے کی وجہ سے وہ اہم کام رک جاتا' ہم لوگوں نے بارہا عرض کیا کہ ملاقات کے لئے ایک وقت مخصوص فرما دیں' تاکہ جس کسی کو ملنا ہو وہ اسی وقت میں آکر مل لیا کرے' اور بے وقت پریشانی نہ ہو' لیکن آپ ہمیشہ اس بات کو ٹال جاتے تھے' جب ہمارا اصرار بہت بڑھا تو ملاقات کا وقت تو مقرر فرما دیا۔ لیکن اگر کوئی شخص دوسرے وقت آ جاتا تو ملاقات سے انکار پھر بھی نہ فرماتے' جس کے نتیجہ میں ہوا کہ وقت کا وہ تعین نتیجہ خیز نہ ہو سکا' جب لوگوں کے بے وقت آنے کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا تو ہم نے پھر کہنا شروع کیا کہ جب تک آپ کچھ لوگوں کو بے وقت ملاقات سے انکار نہ فرمائیں گے' اس وقت تک تعین وقت کا خاطر خواہ نتیجہ ظاہر نہیں ہو گا' ہماری اس بات کے جواب میں آپ ہمیشہ طرح دے جاتے' اور اپنے اس طرز عمل کی کوئی خاص وجہ بھی بیان نہ فرماتے۔

آخر ایک روز میں نے اپنی حماقت سے یہ عرض کر دیا کہ "اباجی! حضرت تھانوی قدس سرہ کے یہاں تو ہر چیز کا نظام الاوقات مقرر تھا اور کسی کو اس کی مخالفت کی اجازت نہ تھی۔"

احقر کی اس بات پر حضرت والد صاحبؒ اس روز پہلی بار کھلے' اور فرمایا:

"ارے بھائی' میں حضرتؒ کے مقام و منصب کی ہوس کروں تو مجھ سے زیادہ احمق کون ہو گا؟ حضرتؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام عطا فرمایا تھا اس کی بنا پر انہیں حق پہنچتا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنے نظام الاوقات کا تابع بنائیں' انہیں جن عظیم دینی کاموں کے لئے اللہ نے پیدا فرمایا تھا' وہ اس کے بغیر کیسے انجام پا سکتے تھے' اس کے علاوہ لوگوں کو ان سے انمول فائدہ پہنچتا تھا' اس لئے اگر اس فائدے کے حصول کے لئے انہیں کچھ مشقت اٹھانی پڑے تو کچھ حرج نہ تھا' لیکن میں کیا ہوں؟ اور میرا مقام کیا ہے؟ میں خلق خدا کو کس بنیاد پر آنے سے روکوں؟ میں نے وقت تو تمہارے کہنے سے مقرر کر دیا ہے' تاکہ لوگوں کو سہولت ہو جائے' لیکن جو شخص محنت اٹھا کر پہنچ ہی گیا' اسے واپس کرنے کا نہ مجھے حق ہے' نہ میرے بس کی بات ہے۔"

اس روز پہلی بار اس طرز عمل کی اصل وجہ معلوم ہوئی' اور اندازہ ہوا کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟ میری عقل حیران تھی کہ جس شخص نے خدمت دین کا اتنا ہمہ گیر کام

انجام دیا ہو' اور جس کا صبح و شام لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ ہو' اسے نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کیا ہے؟ اور نہ اس بات کا اندازہ ہے کہ اس کی ذات سے خلق خدا کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ آپ کے ان جملوں کو محض زبانی بات بھی نہیں کہا جا سکتا' کیونکہ اول تو وہاں غلط بیانی کا شائبہ بھی امکان سے باہر تھا' دوسرے یہ بات تنہائی میں اپنے بیٹے سے کہی جا رہی ہے جہاں تواضع کے رسمی مظاہرے کو کوئی سوال نہیں لہٰذا سوائے اس کے کیا کہہ جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیرا اور من تواضع للہ رفعہ اللہ کا مثالی مظہر بنا دیا تھا۔

صبر و شکر

۲۵۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو "صبر و شکر" کا بھی عجیب و غریب مقام عطا فرمایا تھا' آپ کی زبان اکثر اوقات اللہ تعالیٰ کے شکر سے تر و تازہ رہتی' معمولی معمولی باتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا جزو زندگی بن چکا تھا' کوئی ایسی ملی جلی خبر ملتی جس میں غم اور خوشی دونوں کے پہلو ہوتے تو خوشی کے پہلو پر زور دیتے' اور پہلے اس پر شکر ادا فرمالیتے' اور غم کے پہلو کا یا تو ذکر ہی نہ فرماتے' یا شکر کے بعد غیر اہم انداز میں اس کا تذکرہ کرتے۔

اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں پر آزمائشیں ان کے مقام کے لحاظ سے آتی ہیں' چنانچہ زندگی میں آپ کو بڑے بڑے کٹھن حادثات سے دوچار ہونا پڑا' بیماریاں بھی ایسی تکلیف دہ آئیں کہ ان کی تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں' عین عالمِ شباب ہی سے آپ کو طرح طرح کے عوارض لگ گئے تھے' اور عمر کے آخری آٹھ دس سال تو پیہم مختلف قسم کی بیماریوں کا بار بار حملہ ہوتا رہا' لیکن سخت سے سخت حادثے اور بڑی سے بڑی بیماری پر بھی آپ کو بے صبری کا مظاہرہ کرتے کبھی نہیں دیکھا گیا' اس کے برعکس عادت یہ تھی کہ ہر حادثے اور ہر تکلیف میں قابلِ شکر پہلوؤں پر غور فرما کر ان پر شکر ادا کرتے تھے۔

محرم ۱۳۹۵ھ میں احقر کے سب سے بڑے بھائی مولانا محمد زکی کیفی مرحوم نے اچانک داغِ مفارقت دیا' والد صاحبؒ کو ان سے بے پناہ تعلق تھا' اور نرینہ اولاد میں وہ چونکہ سب سے بڑے تھے' اس لئے زندگی کے ہر مرحلے میں آپ کو ان سے راحت بھی سب سے زیادہ پہنچی' ان کی وفات ایک ایسی رات میں ہوئی جب آپ خود مختلف قسم کی بیماریوں کی بنا پر

صاحبِ فراش تھے' اور ٹانگوں میں ہر پیر کی اتنی اذیت ناک سوزش تھی کہ عمر بھر ایسی اذیت آپ کو بھی یاد نہیں تھی' اس حالت میں آپ کو ایسے جوان بیٹے کی وفات کا صدمہ پہنچا،[1] ہمارے لئے یہ بات نا قابلِ تصوّر تھی کہ اس عالم میں آپ ایسے جانکاہ صدمے کو کیسے برداشت کریں گے! لیکن اس پیکرِ تسلیم و رضا نے اس روح فرسا حادثے پر جو تبصرہ فرمایا۔ وہ بھائی جان مرحوم کے بچوں کے نام ایک خط سے واضح ہو گا۔ اس خط کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ اللہ والے کس انداز پر سوچتے ہیں' اور ان کی پرواز فکر کے آگے دنیا کے بڑے سے بڑے حوادث کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

"میرے عزیز بچو ! یہ واقعہ جیسا کرب انگیز' حسرت ناک و جانکاہ ہے اس کا اثر مرحوم ہو جانے والے نوجوان صالح کے ماں باپ' بچوں اور بیوی اور بھائی بہنوں پر درجہ بدرجہ جو کچھ ہوتا تھا وہ ایک طبعی اور فطری امر ہے' اور جب تک حدود سے تجاوز نہ ہو' شرعاً مذموم بھی نہیں' لیکن یہ سب کرب انگیزی اور غم و صدمہ کا ایک طرفہ پہلو صرف اس بنیاد پر ہے کہ ہم واقعات کو الٹا پڑھتے ہیں' اور یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ ایک پچاس سالہ نوجوان جس کے ساتھ ایک عزیز کی ہزاروں امیدیں وابستہ تھیں' یکایک ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس کا اثر ظاہر ہے کہ بے چینی اور شدید ترین صدمہ ہی ہو سکتا ہے۔

آؤ' اب واقعات کو ذرا سیدھا پڑھو کہ صبر آئے' بلکہ شکر کا موقع ملے۔ ذرا سمجھو کہ ہر مومن کا عقیدہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان کی عمر کی گھڑیاں اور سانس اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کے دفتر میں لکھے ہوتے ہیں' جانے والا لختِ جگر پچاس سال سترہ دن کی زندگی لے کر اس دنیا میں آیا تھا' زمین و آسمان اپنی جگہ سے ٹل سکتا تھا۔ قضا و قدر کے اس فیصلے میں ایک منٹ' ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آ سکتا تھا...... لیکن ذرا یہ سوچو کہ اس حادثہ جانکاہ کو ہم سب پر آسان کرنے کے لئے حق تعالیٰ جل

---

[1] بھائی جان مرحوم سے آپ کے تعلق کا کچھ اندازہ ان کے مکاتیب سے ہو سکتا ہے جو آپ نے ان کے نام تحریر فرمائے ہیں اور جن کا کچھ حصہ اسی اشاعت کے حصہ مکاتیب میں شائع ہو رہا ہے۔

شانہٗ نے کیسے کیسے انعامات فرمائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ الحمد للہ! اپنی تمام ہی اولاد کو وہ اس حالت میں چھوڑ گئے جبکہ وہ کسی کے محتاج نہ تھے...... ذرا سوچو کہ اگر معاملہ اس کے خلاف ہوتا تو یہی ایک مصیبت دس گنی بن جاتی۔

دوسری بات یہ دیکھوں کہ مرحوم کو جس قدر گہرا تعلق اپنی بیوی اور اولاد سے تھا، ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بھی اس سے کچھ کم نہ تھا..... اس سال جب اللہ جل شانہٗ کو اس دنیا سے ان کی جدائی ہمیشہ کے لئے منظور ہوئی تو غیر شعوری طور پر چار مرتبہ ایسے حالات پیدا فرمادیئے کہ ان کو بار بار کراچی آنا پڑا اور ایک مرتبہ سب بچوں کے ساتھ آنے کا موقعہ بھی مل گیا۔ یہ کس کو معلوم تھا کہ یہ بار بار کی ملاقات اللہ تعالیٰ کے انعامات اور آئندہ پیش آنے والے صدمے پر تسلی کے سامان تھے۔

تیسری بات یہ دیکھو کہ سب سے بڑا ہونہار بیٹا مولوی محمود سلمہ، تین ماہ پہلے ان سے جدا ہو چکا تھا جس سے ملنے کی اس حادثہ جانکاہ سے پہلے بظاہر کوئی امید نہ تھی، قدرت نے غیبی سامان فرمادیا۔ امسال ان کے لئے حج کا سامان ہو گیا، اور اس طرح وہ حج وزیارت کے فرائض اور حرمین شریفین کے برکات سے بھی بہرہ ور ہوئے، اور سعادتمند بیٹے کو بھی اٹھارہ دن ان کی مکمل خدمت کا موقع مل گیا۔

پھر یہ بھی سوچو کہ عادۃً حج وزیارت میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس خوش نصیب بندے کو صرف اٹھارہ دنوں میں حج وزیارت کے تمام مراحل سے گزار کر ایسے وقت کراچی پہنچادیا جبکہ ان کی وفات میں صرف سترہ دن باقی تھے۔ اگر مواصلاتی نظام میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تو مرحوم اپنے بیوی بچوں، ماں باپ بہن بھائیوں سے جدا رہتے ہوئے بحالتِ غربت اس دنیا سے سفر کرتے۔ ذرا سوچو کہ اس وقت ماں باپ اور اولاد اور بیوی پر کیا گزرتی۔

اور ان تمام انعامات سے بڑھ کر سب سے بڑا انعام یہ کہ آخری عمر

میں ان کو حج وزیارت سے مشرف فرما کر گناہوں سے پاک فرمادیا، اور پاک وصاف اپنی بارگاہ میں بلالیا۔

اب غور کرو، اگر جانے والے مرحوم کو سال بھر پہلے یہ قطعی اطلاع ہو جاتی کہ عاشورہ محرم ۱۳۹۵ھ ان کی عمر کا آخری دن ہے، اور وہ خود اپنے مرنے کا سامان کرتے تو اس سے بہتر اور مرنے کا کیا سامان ہوتا؟"

اس مکتوب میں حضرت والد صاحبؒ کا یہ مزاج پوری طرح جلوہ فگن ہے کہ وہ سخت سے سخت حادثے میں بھی اس کے قابل شکر پہلوؤں کا استحضار فرماتے، ان پر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے۔ اور مصائب و آلام کے شکوے کے بجائے راضی برضاء رہنے کو آسان بنا دیتے تھے۔

ایک اور واقعہ یاد آیا، احقر کی بڑی ہمشیرہ کے دانت خراب ہو گئے تھے، اور یکے بعد دیگرے انہیں کئی دانت نکلوانے پڑے جس میں انہوں نے کافی تکلیف اٹھائی، ایک مرتبہ وہ دانت نکلوا کر حضرت والد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ نے ان کا حال پوچھا تو اپنا حال بتاتے ہوئے ان کے منہ سے یہ بات بھی نکل گئی کہ "ابا جی! یہ دانتوں کا معاملہ بھی عجیب ہے، یہ جب بچپن میں نکلتے ہیں تو اس وقت بھی تکلیف دیتے ہیں، اور جب ٹوٹنے پر آتے ہیں تو اس وقت بھی تکلیف دیتے ہیں۔"

حضرت والد صاحبؒ نے یہ بات سنی تو قدرے ناگواری کے ساتھ فرمایا! بیٹی: تمہیں ان دانتوں کی بس یہ دو باتیں یاد رہیں کہ انہوں نے آتے وقت بھی تکلیف دی تھی اور جاتے وقت بھی تکلیف دے رہے ہیں، اور ان دونوں واقعات کے درمیان سالہا سال تک تم نے اس خدائی مشین کو استعمال کر کے جو لذت و راحت حاصل کی اس کی طرف کوئی دھیان نہیں؟"

اس طرح حضرت والد صاحبؒ باتوں باتوں میں اپنے متعلقین کو بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استحضار اور ان پر ادائے شکر کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ ہمشیرہ محترمہ نے اس پر فوراً استغفار کیا اور فرماتی ہیں کہ بحمد اللہ اس کے بعد ایسا سبق مل گیا کہ اب ایسے کلمات زبان پر نہیں آتے جن سے ناشکری مترشح ہوتی ہو۔

کشف و کرامات

۴۶۔ کشف و کرامات کے بارے میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کا مذاق وہی تھا جس پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے جابجا زور دیا ہے کہ وہ دین میں مقصود نہیں اور ان کے حصول کے پیچھے پڑنے کے بجائے انسان کو اتباع سنت کی کوشش میں لگنا چاہیے لیکن بہرحال! اس سے کسی اہل حق کو انکار نہیں ہے کہ یہ کمالات اگر اتباع سنت کے ساتھ اور ان کی حقیقت سمجھتے ہوئے کسی کو حاصل ہوں تو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور عطا ہیں...... حضرت والد صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے بعض خاص مواقع پر اس عطا سے نوازا' تھانہ بھون میں رہتے ہوئے آپ کو متعدد مکاشفات ہوئے جن کا تذکرہ حضرت حکیم الامتؒ کے نام آپ کے خطوط میں موجود ہے' اور اس کے بعد بھی کئی مواقع پر آپ کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا گیا' لیکن آپ عموماً اس کا تذکرہ نہیں فرمایا کرتے تھے' اس سلسلے کی جو باتیں ہم میں سے بعض لوگوں کو معلوم ہو گئیں وہ بھی آپ نے کسی ضرورت سے بیان فرمادی تھیں' ورنہ آپ اس کے ذکر سے احتراز ہی فرماتے تھے۔

اگرچہ اس موضوع کا خاصا مواد موجود ہے' بلکہ ایک رفیق کار نے اسی موضوع پر ایک مستقل مضمون لکھ کر دیا تھا' لیکن حضرت والد صاحبؒ کے مذاق و طرز عمل کے احترام میں اس موضوع کو احقر بھی طول دینا نہیں چاہتا' البتہ صرف ایک واقعہ صرف اس لئے ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں پوری امت کیلئے ایک عملی پیغام ہے جس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہیے۔

حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا جب مدینہ طیبہ جانا ہوتا' اور روضۂ اقدس پر سلام عرض کرنے کے لئے حاضری ہوتی تو عام معمول یہ تھا کہ مواجہہ شریف کی جالیوں سے کافی فاصلے پر ایک ستون کے قریب سراپا ادب بن کر سر جھکائے کھڑے رہتے' اور اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں اسی ستون کے قریب کھڑا تھا' دل میں شوق پیدا ہوا کہ آگے بڑھ کر مقدس جالیوں کے قریب تک پہنچ جاؤں' لیکن ہمت نہ ہوئی' اس پر حسرت سی ہونے لگی کہ لوگ آگے تک چلے جاتے ہیں' اور میں دور کھڑا ہوں' اسی دوران یہ محسوس ہوا کہ روضۂ اقدس سے یہ آواز آرہی ہے "کہہ دو کہ جو شخص ہماری

سنتوں کا اتباع کرتا ہے' وہ ہم سے قریب ہے' خواہ بظاہر کتنا دور ہو' اور جو شخص ہماری سنت کا متبع نہیں' وہ ہم سے دور ہے' خواہ وہ ہماری جالیوں سے چمٹ کر کھڑا ہو۔[۱]

حضرت والد صاحبؒ نے اپنا یہ واقعہ اپنا کہہ کر تو گنے چنے چند حضرات ہی کو سنایا' اور خوش قسمتی سے احقر نے بھی آپ سے براہ راست سنا' لیکن یہ بات بہت سی تقریروں میں بھی یہ کہہ کر سنائی کہ ایک زائر کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا' اور اسے روضۂ اقدس سے یہ ہدایت ملی۔

یہاں بھی حضرت والد صاحبؒ نے تمام حدود کو محفوظ رکھا' چونکہ جو آواز محسوس فرمائی تھی اس میں الفاظ یہ تھا کہ کہدو' جس کا مطلب بظاہر یہی تھا کہ یہ بات دوسروں تک بھی پہنچاؤ' اس لئے آپ نے تقریروں اور عام جلسوں میں یہ بات اہتمام کے ساتھ پہنچائی۔ لیکن چونکہ اسے اپنی طرف منسوب کر کے سنانے میں تواضع اور حجاب مانع رہا' اس لئے اپنی طرف صراحۃً منسوب نہیں فرمایا' اور ساتھ ہی کوئی غلط بیانی بھی نہیں فرمائی' بلکہ اسے "ایک زائر" کی طرف منسوب فرمادیا جس سے مراد خود آپ ہی تھے۔

جہاں تک کرامات کا تعلق ہے' سچ پوچھئے تو مجموعی طور سے ان کا پورا انداز زندگی مستقل کرامت ہی تھا' حدود کی رعایت میں یہ باریک بینی' متعارض حقوق میں یہ توازن' طرز معیشت میں یہ متوکلانہ انداز' دنیا میں رہ کر اور اسے بھرپور طریقے سے برت کر بھی قلب وروح کا یہ زہد' دسیوں طرح کی شدید مصروفیات کے عین درمیان اللہ تعالیٰ سے یہ پیہم تعلق و رابطہ' تصنیف و تالیف اور فتویٰ نویسی کی یہ حیرت انگیز رفتار' اتنے مختلف النوع کاموں کی بیک وقت انجام دہی' اور اس کے باوجود چہرے سے لے کر قلب وروح تک چھایا ہوا یہ سکون' غور سے دیکھئے تو ان میں سے ہر ہر بات ایک کرامت تھی' ایسی کرامت جو ہوا میں اڑنے اور پانی میں تیرنے سے کہیں زیادہ مطلوب و محمود اور لائق رشک و تقلید ہے۔

خاتمہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں یہ چند بے ربط سی باتیں جب شروع میں لکھنے بیٹھا تو یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ چند صفحات بھی لکھ سکوں گا' لیکن تقریباً پونے دو

---

[۱] اس عبارت کے اکثر الفاظ حضرت والد صاحب ہی سے سنے ہوئے ہیں' لیکن بعض لفظوں میں معمولی فرق ممکن ہے' البتہ مفہوم قطعاً یہی تھا۔

سو صفحات سیاہ کرنے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مضمون کا آغاز ہی ہے' بے شمار یادوں کا ایک طوفان ہے جو مسلسل ذہن میں اُمڈ رہا ہے' اور زندگی کے نہ جانے کتنے پہلو ہیں' جن کی طرف اشارہ بھی نہیں ہو سکا' لیکن خیال یہ ہوتا ہے کہ ۔

نہ حسنش غایتے دارد' نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

البلاغ کی یہ خصوصی اشاعت انشاء اللہ ایک مفصل اور مربوط و مرتب سوانح کی بنیاد بنے گی۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو باقی ماندہ باتوں کی تکمیل پھر بھی ہو سکتی ہے' فی الحال اس مضمون کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

البتہ آخر میں قارئین سے گزارش یہ ہے کہ اس مقابلے میں احقر نے حضرت والد صاحبؒ کے مزاج و مذاق سے متعلق بہت سی نازک باتیں بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اول تو مجھے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں حضرت کے مزاج و مذاق کو پوری طرح سمجھ چکا ہوں' دوسرے مزاج کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا فی نفسہ بڑا مشکل کام ہے' تیسرے اس کام کے لئے جس ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس مقالے کی تحریر کے دوران مفقود رہی۔ اس مقالے کا بیشتر حصہ مختلف سفروں کے درمیان لکھا گیا اور شاید کراچی میں لکھا ہوا حصہ سفروں میں لکھے ہوئے حصے کے مقابلے میں کم ہی ہوگا' اس لئے ہو سکتا ہے کہ کسی بات، کی تعبیر میں کوئی غلطی یا کوتاہی رہ گئی ہو' اگر کہیں ایسا ہو تو اس کی ذمہ داری مجھ ناکارہ پر عائد ہوتی ہے' صاحب سوانح ؒ اس سے بری ہیں' اور اگر کوئی اہلِ علم ایسی کسی غلطی کی نشان دہی فرمائیں گے تو احقر از بس ممنون ہوگا۔

○

مُطالعے کے دوران چُنے ہُوئے دلچسپ واقعات
علمی وادبی لطائف اور معلُوماتی نکات

جسٹس مُفتی محمّد تقی عُثمانی صاحب

اِدارۃ المعارف کراچی ۱۴